ٹائیٹل: سلطان سبحانی — دیر سے آنکھ پہ اترا نہیں اشکوں کا عذاب

شعر کا چہرہ — اپنے ذمہ ہے ترا قرض نہ جانے کب سے ____ فیضی احمد فیضی

ایڈیٹر

سلطان سبحانی

جلد ۲ • شمارہ ۲ • اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۷ء • کتابت اکبر مرزا • طباعت سردار پریس مالیگاؤں

قیمت دو روپے پچاس پیسے • زرِ سالانہ بیس روپیے • پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر سلطان سبحانی ۔

مینجر شاہ نواب • خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ "ہم زبان" نشاط بک سینٹر قدوائی روڈ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ مہاراشٹر • تاریخ اشاعت ۶ اکتوبر ۷۷ء

اشراج

اختلاف

گذشتہ اٹھارہ بیس سال سے یہ آواز مسلسل گشت کر رہی ہے کہ ترقی پسند ادب کا دور ختم ہو گیا ——
یہ آواز ایک مخصوص حلقہ سے اٹھتی رہی۔ اس حلقہ میں وہ ادیب بھی شامل ہیں جو اپنی ترقی پسندی کے دور میں ہی شکست خوردہ اور زوال پسند ہو گئے تھے۔ انہوں نے صرف اپنے نام اور مقام کے "جہاد" کیلئے دوسرے "اہلِ درد" سے مفاہمت کی اور ترقی پسندی سے انحراف کر کے اپنے زخموں کا ٹانکا توڑنا شروع کیا مگر "حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا" اٹھارہ بیس سال تک ترقی پسندی کے ختم ہونے کا اعلان کرتے کرتے بہت سی آوازیں اپنے انتہائی مدارج پر پہونچ کر گھبرا گئیں مگر ترقی پسندی ہے کہ کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ جب تک دنیا کے کسی ایک انسان میں بھی جینے کا شعور باقی رہے گا ترقی پسندی کو ختم نہیں کہا جا سکتا۔

ان بیس برسوں میں جدیدیت کے بعض سرکاری نقادوں نے ترقی پسند ادب کی مخالفت اور مخاصمت میں سارا غیض و غضب سمیٹ کر بڑے بڑے "شاہنامے" تحریر کئے اور جدیدیت کی حمایت میں سارا زورِ بیان .... سارا حسنِ بیان صرف کر ڈالا مگر .... "نہ ہوا پر نہ ہوا میر سا انداز نصیب" جدیدیت ایک محدود حلقہ میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ ترقی پسندی کی توسیع نہیں بن سکی تو اسی کی جانب مراجعت کرنے لگی اور مختلف حد بندیوں نے اسے کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ——
جدید ادب نے تنہائی، ٹوٹ پھوٹ، خوف، غمِ ذات، بے گانگی اور بے مقصدیت وغیرہ کے جو مسائل پیش کئے وہ ملک کے عوام کے مسائل نہیں تھے۔ اسلئے جدید ادب اتنے سارے برسوں کے عرصہ میں بھی نہ تو سچی زندگی کا آئینہ بن سکا (وہ زندگی جو آنکھوں کے سامنے ہے) اور نہ ہی انسانوں کی بھیڑ میں مقبول ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی ہندوستان تو کیا دنیا کے کسی بھی ملک کے عوام جدید نہیں ہوئے ہیں۔

ترقی پسندی کا مقصد صرف تحریکِ آزادی نہیں تھا اسلئے اس کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس درمیان بہت سے نام بچھڑ ضرور گئے ہیں مگر اس عرصہ میں ترقی پسندوں کی ایک اور نئی نسل بھی تو وارد ہوئی! اور اب تو نئی ترقی پسندی کے امکانات بھی کافی روشن ہیں۔

ترقی پسند تحریک اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک دنیا میں ظلم و جبر، ناانصافی، جنگ، بربریت، سرمایہ داری، غریبی، استحصال اور نسلی تعصبات باقی رہیں گے۔ یہ وہ سخت جان تحریک ہے جو عرصہ قبل خود ترقی پسندوں کے ختم کر دینے کے بعد بھی ختم نہیں ہو سکی ••

اقبالؔ اور ترقّی پسند تحریک

خاطر غزنوی
کراچی ۔ (پاکستان)

دُنیا میں کون ایسا فرد ہے جو ترقی پسند نہیں ۔ ترقی پسندی سے انحراف ۔ جمود پرستی اور زندگی سے بیزاری کا دوسرا نام ہے ۔ زندگی کے ساتھ نمو اور پھلنے پھولنے کا جذبہ انسان ہی نہیں نباتات میں بھی پایا جاتا ہے ۔

دنیا کے ہر ملک کے قدیم ترین ادب میں بھی زندگی سے محبّت کا جذبہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے ۔ گویا ترقی پسندی اس لحاظ سے کوئی نئی چیز نہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر دور میں اس جذبہ کے معیار اور اُصول ترقی پذیر رہے ۔

ادب میں ترقّی پسندی کے دو رُخ ہیں ۔ داخلی اور خارجی یا انفرادی اور اجتماعی اور یہی دو رُخ ایک عرصے سے زیرِ بحث چلے آرہے ہیں ۔ انہی سے "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کے شوشے نکلے ۔

ادب برائے ادب کے قائل کے نزدیک آرٹ کو فرد کی شخصیت کا آئینہ دار ہونا چاہیئے ۔ اور انفرادی جذبات و احساسات کا ترجمان ۔

ادب برائے زندگی کے حامی ادب کو زندگی اور ماحول سے مکمل طور پر وابستہ کہتے ہیں ان کے خیال میں ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی ۔

۱۹۳۶ء سے پیشتر جب کہ برِّصغیر میں ترقی پسندی نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار نہ کی تھی ۔ ادیب اور شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی اور ماحول کو ادب سے جُدا نہ کر سکے ۔

یاسیت پرست میرؔ بھی ماحول کی ترجمانی سے کنارہ کشی نہ کر سکا ؂

دِلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مُصوّر تھے
جو شکل نظر آئی ، تصویر نظر آئی

خانقاہ پسند دردؔ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ؂

محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دِل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

غالبؔ جیسے صاحبِ نظر شاعر نے یہ شعر کہہ کر کتنی ہی حقیقتوں کی نقاب کشائی کر کے زندگی کی تفسیر کر دی ۔ ؂

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

ترقی پسند تحریک کے زعما تسلیم کرتے ہیں کہ ادبی اور علمی تحریکیں اور نظریئے وقتی تقاضوں

سے یقیناً پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن پچھلے تہذیبی سرمائے اور گذشتہ روایات پر اپنی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ یوں ہم غالب سے ہٹ کر نظر دوڑائیں تو نظیر اکبرآبادی ایک بلند مقام پر نظر آتا ہے۔ واضح اور نمایاں ۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعری کو ترقی پسند تحریک کے تقریباً سبھی مقتدر رہنماؤں نے عوامی اور مفید کہا ہے ۔ مفید اس نقطۂ نظر سے کہ اس کی شاعری عوامی تھی۔ عوام کے لیے تھی ۔ اس نے عوام کو مسرت بھی بخشی اور معاشرے کی ترجمانی اور تنقید کا فرض بھی ادا کیا ۔

ترقی پسند تحریک کی جمہوری روایات کے تسلسل میں سرسید، حالی، شبلی، اکبر اور اقبال کو اہم کڑیاں تسلیم کیا گیا ہے ۔ ان کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر ادب اور سماج کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ۔ سرسید، شبلی اور حالی کے ہاں ادب کی نئی قدروں کی روشنی ملتی ہے ۔ اکبر الہ آبادی اپنے عصر کے حالات کا رد عمل طنز کی نشتریت کی صورت میں پیش کرتے ہیں ۔ وہ معاشرے میں مغرب کی اچھی اور بری باتوں کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں ۔ لیکن اقبال ان سب سے ایک قدم آگے بڑھ کر مستقبل کے پیامی اور ایک واضح مقصدیت کے علمبردار کی حیثیت میں رونما ہوتے ہیں ۔ اقبال کے ہاں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا شعور اور آگاہی ملتی ہے ۔ اُردو کے یہ سبھی ادیب و شاعر نمایاں طور پر مقصدیت کے حامل ہیں ۔ ماحول پر نظر رکھتے ہیں اور ادب کو اپنے ماحول کا ترجمان اور نقاد سمجھتے ہیں ۔ اور اس لیے شعوری طور پر ترقی پسند ہیں ۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے منشور نے ترقی پسندی کے رجحانات کو ایک باقاعدہ اور منظم شکل دے دی ۔ اس منشور کی رو سے ادب میں فراریت کو رد کیا گیا اور سائنسی عقلیت پسندی کے فروغ پر زور دیا گیا ۔ اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ گردانا گیا ۔ وطن کو نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھانے کی ذمہ داری ادیب پر ڈالی گئی اور زندگی کے بنیادی مسائل یعنی بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کو موضوع بنانے کی تلقین کی گئی ۔

لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی مخالفت کی گئی ۔

ادیبوں پر یہ فرض عائد کیا گیا کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشوونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں ۔

یہ دور وہ تھا کہ اقبال کی زندگی کا چراغ بجھنے کو تھا ۔ لیکن علی سردار جعفری کے بقول اس تحریک کی یہ سعادت تھی کہ اسی کو "ٹیگور" ۔ پریم چند اور جوش ملیح آبادی کی سرپرستی نصیب ہوئی اور علامہ اقبال کی دعائیں ملیں ۔

گویا ترقی پسندی کے ان بنیادی اصولوں سے شعوری طور پر متفق ہونے کی وجہ سے علامہ اقبال نے اس تحریک کو بنظر استحسان دیکھا ۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ آیا علامہ اقبال کا فن ان تمام ترقی پسندانہ رجحانات کا داعی تھا جنہیں ان کی عمر کے آخری دنوں میں اس منظم تحریک کے تحت مرتب کیا گیا، گویا انہوں نے ترقی پسند تحریک کے اصولوں کو نہیں اپنایا بلکہ ترقی پسند تحریک کے اصولوں میں اقبال کے شعور، اس کی جدت پسندی اور انسان دوستی کا پرتو ہے ۔

ترقی پسند نقادوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء و ادباء پر یہ پابندی عائد کر دی کہ ان کا ادب اور ان کی شاعری نہ صرف عوام کی مسرت اور فائدے کے لیے ہو بلکہ عوام کی ذہنی سطح کے مطابق بھی ہو اور ان کی زبان میں ہو ۔ یہ "ادب برائے زندگی" اور "ادب برائے عوام" کا سب سے بڑا اور اہم نعرہ تھا ۔ ان کے نزدیک ادب نہ تو چند پیٹ بھروں کی میراث ہے اور نہ ذہنی عیاشی کا سامان ۔ انہوں نے ادب کو عوام کی ملکیت قرار دیا اور اس پر زندگی کے سدھارنے اور سنوارنے کے مقدس فرائض عائد کئے ۔ اور جدوجہد حیات میں اسے ایک حربے کی طرح استعمال کرنے کی تلقین کی ۔

اس نعرے کے تحت اقبال ایک حد تک تو ترقی پسندی کی حدود میں رہتے ہیں کہ انہوں نے بھی ادب کو ذہنی عیاشی کا سامان نہ کہا اور ایسے شعراء و ادباء کے بارے میں اپنے نظریات کا واضح اظہار کر دیا جو جنسیت اور لذت پرستی کا شکار تھے یا آنے والے زمانوں میں فرائڈ اور ڈی ۔ ایچ ۔ لارنس کے پیروکار بننے والے تھے ۔ ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس !

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ترقی پسند نقادوں نے بھی بعد میں منٹو اور عسکری کو جنسی پرستی کی سزا کے طور پر مردود قرار دے کر ترقی پسندوں کی صفوں سے خارج کر دیا۔ عوام کی ذہنی سطح پر اتر کر ان کی زبان میں ادب تخلیق کرنے کے نعرے کی رو سے اقبال کو ترقی پسند کہنے میں تامل ہوتا ہے۔ اسلئے کہ اقبال کی زبان عوام کی زبان نہ تھی۔ ان کا فلسفیانہ کلام مشینوں کے شور میں گم مزدوروں اور ہل میں باندھے ہوئے بیلوں پر چھڑیاں برسانے والے کسانوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ یہی وہ مقام بھی ہے جہاں بندوں کو تولنے اور گننے کا مسئلہ زیر بحث آجاتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ عوام کے لیے نہیں، عوام کے بارے میں ضرور ہے۔ ان کی شاعری خواص کے لیے ہے لیکن ان خواص کے لیے نہیں، جنہیں بورژوا طبقے کا نمائندہ کہا گیا۔ یہ ان خواص کے لیے تھا اور ہے جسے دانشور کہا جاتا ہے۔ جن کے ذہن عوام کی قوت کے ساتھ مل کر انقلاب لائے ہیں۔ اور جن کا علم اور جن کی عالمی تاریخ و سیاست پر گہری نظر عالمی سیاست کے بھرپور وار کو روکنے کا حوصلہ اور سلیقہ رکھتی ہے ـــــ اسی لیے اقبال کی شاعری کے مخاطب عوام اور خواص دونوں ہیں ـــــ وہ لوگ گیتوں سے انقلاب لانے والے شاعر نہ تھے۔ ہاں ـــ یہ ضرور تھا کہ اقبال اُردو ادب کے وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعری میں واضح مقصدیت کو سمویا اور ایک منزل کو پیش نظر رکھا اور اپنے پیغام کی روشنی میں لوگوں کو آگے بڑھنے اور انقلاب لانے کا حوصلہ دیا۔

وہ مغرب میں نمودار ہونے والی تحریکوں سے پوری طرح واقف تھے۔ اور انکے بارے میں اپنی ایک رائے رکھتے تھے۔ مارکس اور لینن کی تعلیمات سے باخبر تھے۔ انقلاب روس کو انہوں نے "بطن گیتی" سے "آفتاب تازہ" کے طلوع ہونے کے مترادف قرار دیا۔ ان کا یہی جذبہ فرشتوں سے فرمانِ خدا کی صورت میں سامنے آتا ہے ؎

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخِ اُمرا کے در و دیوار کو ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے

کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ

جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

وہ لینن کو "نیست پیغمبر ولے دارد کتاب" کا اعزاز بخشتے ہیں۔ اور لینن کو خدا کے حضور میں پیش کر کے ایسے خیالات پیش کرتے ہیں جن سے مادیت اور روحانیت کی روشنی میں گرجوں اور بنکوں کی عمارات کا فرق واضح ہو ـــ

اور پھر خود اس مقام پر پہنچ کر لینن سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

دُنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

سرمایہ پرستی کے خلاف لینن کی آواز یا اقبال کی آواز ہے جو ترقی پسند تحریک کا بنیادی اصول ہے۔ اور بھوک، افلاس اور سماجی پستی کے خاتمے کا منشور ـــ

غلامی اس دور کا ایک غیر معمولی مسئلہ تھا۔ یہی وہ مسئلہ ہے جسے علامہ اقبال کی شعری تحریک۔ فکری جدوجہد اور عملی سیاست کا بنیادی مسئلہ کہا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے منشور کی یہ شق بھی علامہ اقبال کے قول و فعل کا پرتو ہے۔

"لاچاری پستی اور توہم پرستی کی مخالفت" کے موضوع سے اقبال کی کوئی تصنیف خالی نہیں۔ لاچاری کو اقبال ایک جرم سمجھتے ہیں۔ ابوالعلا معریٰ کے سامنے رکھے ہوئے مجبور و لاچار بھونے ہوئے پرندے سے معریٰ کے الفاظ میں کہتے ہیں ؎

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

ناتوانی زندگی را رہزنی است
بطنش از خوف و دروغ آبستنی است
توانائی صداقت توام است
گر خود آگاہی ہمیں جامِ جم است
زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

• فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کے رجحانات کی روک تھام کی شق پر علامہ اقبال کے ان افکار کی چھوٹ نمایاں ہے ؎

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

رہا دل بستۂ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ

عزیز ہے انہیں نام وزیری و محسود
ابھی یہ خلعتِ افغانیت سے ہیں عاری

ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری

نے افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

علامہ اقبال کے خیالات کا عکس ترقی پسند تحریک کے منشور پر بڑا گہرا اور واضح ہے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے نامور راہنما علی سردار جعفری نے ترقی پسند نقادوں کو ماضی کے پتھروں کے نیچے سے ان سرچشموں کو ڈھونڈ نکالنے کی ترغیب دی۔ جن سے صدیوں تک ہماری کشتِ ادب کی آبیاری ہوتی ہے۔ سرسید۔ حالی۔ شبلی۔ اور اکبر بقول جعفری باوجود اپنے تمام تضادات اور الجھاووں کے اردو میں جمہوری شعر و ادب اور جمہوری تنقید کے بانی ہیں۔ جن کا براہ راست تعلق ہماری تحریکِ آزادی کے ترقی پسند پہلوؤں سے ہے۔ اقبال کی شاعری میں سرسید، حالی، اور شبلی اور اکبر کی روایات کا امتزاج ہے۔ لیکن علم و فن کی زیادہ بلند سطح پر جو رجحانات ان کے یہاں دبے دبے تھے وہ اقبال کے یہاں پوری شدت سے ابھرتے ہیں۔ جو خاکے نامکمل تھے اقبال کے ہاتھوں ان میں رنگ بھرا جاتا ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اقبال کی ترقی پسندی انسانیت کیلئے ہے۔ آزادی کے لیے ہے۔ وہ بیداری کی نقیب ہے۔ فرقہ پرستی اور نسلی تعصب کے خاتمہ کے لیے ہے۔ ان کی شاعری میں انسان کی خودنگری اور اپنی طاقت پر اعتماد کی تلقین ہے۔ چین آج اس اصول کو اپنائے ہوئے ہے۔ آج کا چینی اپنے بازو کو خدا کا درجہ دیتا ہے۔ خدا اس کے لیے قوت اور طاقت کا رمز ہے۔ ایک جدید چینی نظم ان خیالات کا احاطہ کچھ اس طرح کرتی ہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

حفیظ مالیگانوی

۴۳۹ ۸ ، نیا پورہ ۔ مالیگاؤں (ناسک)

ہر ایک چیز کو جب آفتاب کرنا تھا
مجھی کو کس لیے پھر انتخاب کرنا تھا

جہانِ نَو کو بنانا تھا پاک تو پہلے
نفس نفس سے ہویدا حجاب کرنا تھا

کہا تھا کس نے جہانِ خراب کی خاطر
ہر ایک بوند کو جوئے شراب کرنا تھا

زباں کو طاقتِ گفتار ہی نہ دی ہوتی
جو گفتگو میں مجھے لاجواب کرنا تھا

دیا تھا آپ نے پھر کیوں پیامِ بیداری
تمام عمر اگر محوِ خواب کرنا تھا

تابشِ احساس سے جو لوگ تابندہ رہے
ان کے افکار و عمل ہر دور میں زندہ رہے

ہو گئے برسوں مگر آتش فشانی ہے وہی
ہم جہاں پر بھی رہے شعلے ہی رقصندہ رہے

ظلمتِ حالات و رقصِ بربریت دیکھ کر
فکر و دانش کے امیں کیا اس پہ شرمندہ رہے

کیا ستم ہے ایک اِک لمحہ پہ تھی جن کی نظر
وقت کے ہاتھوں وہی صدیوں پراگندہ رہے

لکھ لیا تاریخ نے سونے کے حرفوں سے حفیظؔ
کتنے دن انسانیت کے ہم نمائندہ رہے

حفیظ مالیگانوی

پُرکشش جتنا لہجہ فسانوں میں ہے
کیا حقیقت کے شیریں بیانوں میں ہے

کوئی فرہاد ہی عصرِ نَو میں نہیں
جُوئے شیر اب بھی ورنہ چٹانوں میں ہے

ذوقِ پرواز و جوشِ جنوں ہے مرا
وسعتِ لامکانی مکانوں میں ہے

شیشۂ دل پہ جو عکس آرا نہیں
کون سی شئے نہاں آسمانوں میں ہے

سانحہ جو بھی گذرا کسی پر حفیظ
زندگی بن کے میرے ترانوں میں ہے

دمک رہی تھی جو اِک زندگی سویروں میں
کسی نے روند کے پھر رکھدیا اندھیروں میں

زباں سے حرفِ صداقت بلند کیسا ہوتا
پڑے ہیں لوگ ابھی مصلحت کے پھیروں میں

مجھے یہ خوف ہے انسان ہی نہ کھو جائے
خود اپنی ذات کے پھیلے ہوئے اندھیروں میں

زمانہ لے نئی کروٹ بھی جس کے پرتو سے
وہ آب و تاب کہاں وقت کے تھپیڑوں میں

ہر ایک لمحہ خبر لا رہا ہے صدیوں کی
گھرا ہے جب سے مرا قافلہ لٹیروں میں

نئے افسانے کی سمجھ

ڈاکٹر افصح ظفر

دارالسلام - جگ جیون روڈ (ساؤتھ) گیا - بہار

نئے افسانے کی سمجھ نے پس منظر میں ٹیڑھی کھیر معلوم ہوتی ہے - میرا اپنا خیال یہ ہے کہ نئے افسانے کو سمجھنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ پُرانے افسانے سے رشتہ ناطہ توڑ لیا جائے - رشتہ کبھی ٹوٹتا نہیں، اس میں سختی اور نرمی پیدا ہوتی رہتی ہے - جیسا کہ عام طور پر انسانی برادری میں ہوتا ہے کہ رشتہ لاکھ ٹوٹ جائے مگر اس کا گلہ باقی رہتا ہے - اسی طریقے سے نیا افسانہ پُرانے افسانے سے کبھی بھی معلق نہیں ہو پایا ہے ــــ پُرانے افسانے کی بنیاد کیا ہے؟ وہی بنیاد جو ایڈگر ایلن پُو نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے رکھی تھی کہ افسانے میں زندگی کا واحد اثر موجود رہتا ہے - واحد اثر (SINGLE EFFECT) کی بنیاد پر ہم وحدتِ اثر کی ترکیب استعمال کرتے رہے ہیں - اس وحدتِ اثر کو پانے میں وہی افسانہ نگار کامیاب ہوتا ہے جو اپنے افسانے کے نرمی حصے میں تضاد اور چشم زدن کی کیفیت پیدا کرکے پوری ڈرامائیت کے ساتھ اسے پیش کر دیتا ہے - چیخوف کا افسانہ "بازی" اور ہنری کا افسانہ "تحفہ" اس سلسلے کی بہترین مثال ہیں -

ہمیں سمجھنا یہ ہے کہ پُرانے افسانہ نگار ایسی ڈرامائیت کو کیوں ضروری سمجھتے تھے ــ؟ غور کیجیے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یورپ کی انیسویں صدی کی ترکیب تقریباً وہی تھی جو بیسویں صدی میں ہمارے یہاں پریم چند کا دور کہلاتا ہے - یوروپی سماج میں انیسویں صدی الجھنوں کی ابتدا کی صدی تھی، مگر یہ طے ہے کہ شخصی زندگی اتنی زیادہ اُلجھنوں کا شکار نہیں نظر آتی ہے جتنی ہم بیسویں صدی میں دیکھتے ہیں - ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی خیال رہے کہ یورپ میں اُس عہد کے ادب نواز یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ناول کا فن نقطۂ انجماد پر پہنچ چکا ہے - فن کار کہانی میں شعوری اور غیر شعوری طور پر اکتاہٹ سے دوچار ہو رہے تھے اور انہیں نئے کینڈے کی تلاش تھی - اس تلاش میں وہ تخت یا تختہ کے اصول پر کاربند نہیں ہوتے - ادب سیاست نہیں ہے کہ اس کا فیصلہ چاہے اس چھور، یا چاہے اُس چھور کر دیا جائے - ادب کا انقلاب بس اُلٹ پھیر کر کے رہ جاتا ہے - اسی لیے جب پرانے افسانہ نگار نئے میڈیم (MEDIUM) کو اپناتے ہیں، تو وہ کہانی کے اجزا سے انحراف کرتے ہیں مگر کہانی کے کسی نہ کسی جُز کو برقرار ضرور رکھتے ہیں - اسی لیے پُرانے افسانے اور ناول میں ہمیں سب سے پہلے حجم کا فرق معلوم ہوتا ہے - اور اس فرق کو ساعتوں میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں مختلف نقادوں اور افسانہ نگار کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں - ساعتوں کے پس منظر میں افسانے کی تفہیم اس لیے کی جاتی رہی کہ ابھی زمان کے عنصر میں چوتھی سمت نہیں داخل ہوئی تھی - اسے اور صاف طور پر یوں کہہ لیجیے، کہ طبیعیاتی طور پر ابھی نظریۂ اضافت

سامنے نہیں آیا تھا، ابھی سارے کہانی کار اپنا سارا زور تیسری سمت کو اُبھارنے میں صرف کئے ہوئے تھے۔ اس عہد کی رسائی بس یہیں تک ہو بھی سکتی تھی۔ اسی لیے پُرانا افسانہ نگار واقعات کے سلسلوں سے کسی طور پر اپنا ناطہ توڑ نہیں سکا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پُرانا افسانہ نگار زیادہ تر خارجی رہتا ہے۔ مگر یہاں پر یہ بات غور طلب ہے کہ دنیا کے بہترین افسانوں کا اگر مطالعہ کریں تو آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ یہ افسانے خارجی طور پر کچھ سمجھ میں آتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتے۔ ایسے کچھ افسانے جو کچھ سمجھ میں آتے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتے وہ ہیں جن میں افسانہ نگاروں کے ذاتی نقطۂ نظر کی ترسیل نہیں ہو پاتی۔ آپ اپنے طور پر ترجمانی کرتے چلے جائیں ان کا مزا دوگنا ہوتا چلا جائے گا۔

اس تذکرے سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ افسانوں کو سمجھنے کے سلسلے میں ایک وسیع تناظر قائم کرنا چاہیے۔ آج نئے افسانے کا التباس ہمیں اُلجھن میں ڈال دیتا ہے۔ قاری کا ایک بڑا طبقہ ایسے افسانوں کو سمجھ نہیں پاتا مگر اس سلسلے میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور مل جاتے ہیں جو نئے افسانے کو سمجھنے کا پورا دعویٰ کرتے ہیں ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جو نئے افسانے کو شاعری کے زمرے میں داخل کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ نئے افسانے کو معلّق ہو کر جب اپنی ذات میں جراءت کر لیتے ہیں تو وہ نیا افسانہ ان کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ نیا افسانہ نہ شاعرانہ طریقے پر پوری طرح سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ اُسے معلق کر کے ذاتی طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ نئے افسانے کو پرانے افسانے کی توسیع میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

پہلے پُرانے افسانے میں کیا ہوتا تھا؟ —— ہوتا یہ تھا کہ دھیرے دھیرے افسانے کی کڑی آگے بڑھتی تھی۔ مگر انجام پر پہنچ کر جا کر یہ کڑی جب ٹوٹتی تھی تو ہمیں ذہنی و جسمانی طریقے پر ایک جھنکار کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پُرانا افسانہ نگار یہ جھنکار کیوں پیدا کرتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس عہد میں سماجی طور پر زندگی کی رفتار نسبتاً دھیمی تھی۔ اسلیے افسانے کے آخری حصّے میں برق وشی صورت حال پیدا کر کے اس عہد کے سماجی ذہن کی تسکین ہو جاتی تھی۔

پُرانا افسانہ نگار اپنے سماجی حالات میں اسی لیے وسعت میں پھیلتا ہوا ارتکاز میں سمٹ جانا چاہتا ہے۔

کیا ہم آج کی دنیا کے سماجی حالات کے پس منظر میں اس طرح سمٹ سکتے ہیں —؟ نہیں۔ کیوں کہ آج کی دنیا دھیرے دھیرے چلنا بھول گئی ہے۔ آج کا ذہن برق وشی صورت حال کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے۔ آج کا افسانہ نگار اس طرح ارتکاز سے سفر کر کے وسعت تک پہنچنے میں کمالِ فن سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں نیا افسانہ بہت کم سمجھ میں آتا ہے۔ پہلے بھی پُرانے افسانے کو لوگ نہیں سمجھتے تھے، مگر نہیں سمجھنے والوں کی تعداد بہت مختصر ہوتی تھی۔ آج ہماری اُلجھن یہ ہے کہ نئے افسانے کو نہ سمجھنے والے اچھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ یہاں پر یہ بھی خیال رہے کہ یہ خیالات ایسی زبان میں تحریر کئے جا رہے ہیں جس کا تعلق نیم ترقی یافتہ یا نسبتاً کم ترقی یافتہ ملکوں سے ہے۔

یورپ میں یا پھر ترقی یافتہ ملکوں میں نئے افسانے کو نہ سمجھنے والے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ جملۂ معترضہ کے طور پر اس بات کا ذکر ضروری تھا کہ اسے عمومی انداز سے بچایا جائے ۔

جب نیا افسانہ نگار ارتکاز سے چل کر وسعت تک پہنچتا ہے تو درحقیقت وہ فنِ افسانہ میں تحت یا تختہ نہیں کرتا۔ وہ جب وسعت تک پہنچتا ہے تو اس کی وسعت میں ایک (CONCENTRATION) ہم مرکزیت ہوتی ہے۔ چوں کہ ایک صدی کے بعد کی یہ دُنیا بہت آگے جاچکی ہے اس لیے اس کے خوابوں کے دروازے بند ہو چکے ہیں، اور حقیقتیں اتنی زیادہ سامنے آچکی ہیں کہ آج کا نیا افسانہ نگار حقیقتوں کے اس محشرستان سے عاجز عاجز ہو چکا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ فنکار چاہے نیا ہو یا پُرانا اُس کے فن کا انحصار اُس کے خوابوں پر ہے جب یہ خواب ٹوٹ چکے ہیں تو یہ افسانہ نگار پھر کس طرح پرانے افسانوں کے ڈھرّے پر زیادہ دیر تک جی سکتا ہے۔ لہٰذا آج اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ بہر طور اس فنطاسیہ کو نہیں چھوڑے جس کی وجہ سے اس کے تخلیقی کرب کو تسکین ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیا

افسانہ نگار حقائق کو اسطور (MYTH) بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

نئے افسانے کی الجھنیں یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسطور تاریخی یا جغرافیائی لحاظ سے ہمارے سینوں میں بھی محفوظ ہے اور ہمارے علم میں بھی۔ تاریخ کا پرانا واقعہ یا لوک کہاوت گرچہ اجنبی نہیں ہیں مگر جب ہمارے یہاں نئے فنی پیمانوں میں اسے آج ڈھالا جاتا ہے تو اس میں تکرار سے زیادہ باز آفرینی ہوتی ہے۔ باز آفرینی کے لیے تخلیقی جودت ناگزیر ہے۔ تکرار کے لیے تو تاریخ اور لوک کتھائیں ہیں۔

افسانے کا نیا ذہن اب پردہ دری کے زیادہ پردہ پوشی چاہتا ہے۔ نئی سائنسی دنیا نے خوابوں کو حقیقت بنا کر کہانی کاروں کو چیلنج کر دیا ہے۔ نیا کہانی کار آج دراصل حقیقتوں کو خوابناک بنا کر کسی نئی سمت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کہانی کا ارتقائی سلسلہ زیرِ غور رہے تو محسوس ہوگا کہ پہلے کہانی اکہری تھی، پھر دوہری ہوئی، پھر اس میں ابھارے تیسرا رخ پیدا کیا گیا۔ مگر اب جب ششِ جہات آئینہ ساماں بن گئے ہیں تو پھر افسانہ نگار آرکے ٹائپ کا سہارا لیکر اس دنیا میں چلا گیا ہے، جو ابھی بھی بے پایاں ہے۔ یعنی ذاتِ انساں، تاریخ، اور جغرافیہ، مذہب اور سیاست۔ آدمی اور انسان کی ہزاروں تشکیلیں سامنے آکر انسان کی ذات کو آج شخصی طور پر تہہ در تہہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ نئے افسانہ نگار کی ذہانت اور اس کے ساتھ اس کی تخلیقی انا کو اس تہہ در تہہ کیفیت سے تسکین ملتی ہے اور وہ اس طرح اپنے افسانوں میں خود کو بھی کھو دیتا ہے اور قاری کو بھی کھو جانے پر مجبور کرتا ہے۔

نئے افسانے کی سمجھ کا جھگڑا یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ کھونے کی جبلت ایک سرشار قسم کی بے خودی ضرور ہے لیکن یہ طے ہے کہ کھونے کے بعد پانے کی جبلت بھی پیدا ہوتی ہے۔ نئے افسانوں میں وہی افسانہ نگار کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے اوپر موسیٰ علی بے ہوشی طاری کرتے ہیں۔ اردو کے نئے افسانہ نگاروں میں یہ افسانہ نگار کچھ اسی قسم سے بے ہوش نظر آتے ہیں۔ انور سجاد، بلراج مینرا، جوگیندر پال، انور عظیم، رتن سنگھ، اقبال مجید، اقبال متین، خالدہ اصغر، احمد یوسف، ظفر اوگانوی اور اس گروہ میں دو نئے افسانہ نگاروں کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔ عبد الصمد اور حسین الحق۔

میں نے اس گروہ میں دو مقبول ترین افسانہ نگاروں غیاث احمد گدی اور کلام حیدری کو نہیں شامل کیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ پچھلے صفحات میں میں نے کہا ہے کہ نیا افسانہ بھی کسی نہ کسی طرح پرانے افسانوں کی توسیع ہے۔ غیاث احمد گدی اور کلام حیدری اس توسیع کو خالص تکنیکی انداز سے برت رہے ہیں۔ گدی کا "میمنہ" اور حیدری کا "کسی کی کہانی" پڑھ کر یہ بات خاص طور پر محسوس ہوتی ہے۔ توسیع کے رویہ کو بہت ٹیکنیکل ہو کر یہ افسانہ نگار اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ یہ ابھی مختصر افسانے کے اجزائے ترکیبی سے پوری طرح نہیں نکل پائے ہیں جبکہ بقیہ مذکور افسانہ نگاروں نے تو کے واحد اثر کا خیال رکھتے ہوئے اپنے افسانوں کو نشوونما بخشا ہے۔ گدی اور حیدری مختصر افسانے کی عضویاتی ترقی کو روایتی میکانزم سے بہت دور نہیں لے جاتے۔ انور سجاد وغیرہ اس عضویاتی ارتقا کو اس طرح عکس ریز کرتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں چھوٹی شے بہت بڑا حجم اختیار کر لیتی ہے اور بڑی شے چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ انور سجاد کا "کونپل"۔ بلراج مینرا کا "وہ"۔ اور انور عظیم کا "درد کا ساحل کوئی نہیں" بڑی سے چھوٹی ہونے کی سب سے اچھی مثال ہے۔ احمد یوسف کا "خطِ منحنی"۔ انور عظیم کا "ٹھنڈی سرنگ"۔ عبد الصمد کا "درمیان کے کنارے"۔ ظفر اوگانوی کا "ریس کے گھوڑے" جوگیندر پال کا طویل افسانہ "آمد آمد" چھوٹی سے بڑی ہونے کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی نئے افسانے کی تفہیم میں الجھنیں بڑھائی ہیں۔ سریندر پرکاش کے افسانوی مجموعے "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" کے پیش لفظ میں اس قسم کے جملے فاروقی کے قلم سے نکلے ہیں۔

" نیا افسانہ نئی شاعری کے مقابلے میں زیادہ حیران کن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تنقید کرتے وقت ہم اکثر و بیشتر یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ادب حکیمانہ یا سائنسی تعمق اور موشگافی کا نام نہیں بلکہ انسانی تجربات کو الفاظ کا لباس پہنانے کا نام ہے "۔ مواد کی اہمیت سے دامن چرانے کے بعد کچھ اسی قسم کی بات کہی جا سکتی ہے۔ سائنسی تعمق جیسے عالمانہ الفاظ کے استعمال میں بذاتِ خود گہرائی نہیں موجود ہے۔ انسانی تجربات بذاتِ خود ایک عالمانہ عمل بھی اور عارفانہ نکتہ بھی ہیں۔ اسے یوں کہیے۔ بینڈنگ

کانفرنس کی ساری روداد کو اسٹیٹس مین کے اداریہ نے ایک مشاعرہ کہہ کر غیراہم قرار دیا تھا۔ اسی بات کو ایک درزی نے (جو دوسروں سے اخبار پڑھوا کر سنتا تھا) بھی کہا تھا۔ کیا ہندوستان کے ایک دانشور مدیر کی بات عالمانہ نہیں؟ اور کیا درزی کا ایسا ہی اظہار عالمانہ قرار نہیں دیا جا سکتا؟ جبکہ ہم تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات سمجھتے ہیں کہ مدیر کا ریمارک عالمانہ ہے اور درزی کا تجرباتی۔ اب آپ سوچیے کہ تجربہ علم ہے یا نہیں؟ — فاروقی اسی قسم کے گورکھ دھندے سے مواد کی اہمیت کو کم کرنے کی خاطر غریب سریندر پرکاش کو خوامخواہ کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ سریندر پرکاش کے یہاں بھی موضوع یا مفروضہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ جہاں پریم چند کا موضوع کسان اور عصمت کا مفروضہ متوسط طبقے کی لڑکیاں ہیں، وہاں سریندر پرکاش کے افسانوں کے موضوع وہ شہری لوگ ہیں جو سوچ سوچ کر نئے حالات میں روز بروز اُلجھتے چلے جاتے ہیں۔

آج کا نیا افسانہ شاعری سے قریب نہیں ہے۔ ہاں، اس میں نظم (POEM) کی ایک کیفیت شامل رہتی ہے۔ اسے جب ہم بغور دیکھتے ہیں تو یہ خصوصیت نئے افسانوں کی نہیں بلکہ یہ مختصر افسانے کی خصوصیت ہے جس میں نئے پرانے کی کوئی تخصیص نہیں۔ تجربے کے لیے آپ 'کفن'، 'کالو بھنگی'، 'دو فرلانگ لمبی سڑک'، 'کھول دو'، 'بھولا'، 'شکر گذار آنکھیں' قسم کے افسانے پھر پڑھ لیجئے۔

نئے افسانے کی سمجھ کے سلسلے میں علم کا تصور اکادمیائی انداز سے نہ کرکے اگر اسے سماجی شعور کے وسیع تناظر میں رکھ کر قائم کیا جائے تو نیا افسانہ ہماری خرد کا حصہ بن سکتا ہے۔ اس سلسلے میں فن اور فن کار کے رویّہ کا توسیعی جائزہ معاون ہو سکتا ہے۔ یہ جائزہ تاریخی طور پر بھی معاونت اُسی وقت کر سکتا ہے جبکہ ہم اُسے ارتقائی طور پر سمجھیں۔ ایسا کرنے سے وہ تسلسل قائم ہو جاتا ہے جو ہم سب کو پریم چند سے جوڑا بھی رکھتا ہے اور اپنی شاہراہ الگ بھی بناتا ہے۔ اسی طور پر ہماری افسانوی روایت چلی اور بڑھی ہے۔ اور اس روایت نے ہمیں نئے عہد میں راجندر سنگھ بیدی کو زندہ رکھا ہے۔ دانہ و دام سے لیکر ہاتھ ہمارے قلم ہوئے تک یہ ارتقائی سلسلہ الفاظ سے زیادہ معانی پر قائم ہے۔

نئے عہد کا نیا افسانہ نگار وہیں پھلتا پھولتا نظر آتا ہے جہاں وہ مسائلِ حیات کو نئی اقتصادی پیچیدگیوں میں دیکھتا ہے۔ چند ایک ہی افسانہ نگار ایسے ہیں جو بعض سازشوں کے غلام بن کر بائیں سے دائیں ہو جاتے ہیں اور ایسی مراجعت کرتے ہیں جو نسلی طور پر بھی سمجھ سے باہر ہو جاتی ہے۔ جیسے انتظار حسین۔ نئے کامیاب افسانہ نگاروں کے قافلے کا سفر بائیں بائیں ہی طے پا رہا ہے۔ سولزے نتسن کو سر آنکھوں پر بٹھانے والے ظفر اوگانوی بھی اپنے افسانوں کی بنیاد اقتصادیات، سیاسیات اور سماجیات پر رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان تینوں اجزا کی بنیاد پر قائم کئے گئے افسانوی محل ہوا میں تعمیر نہیں کئے جا سکتے۔ ان میں موضوع کی اہمیت ہوگی ہی۔

جب ایسی بات ہے تو پھر کونسی رکاوٹ ہے کہ نئے افسانوں کی ترسیل ممکن نہیں ہو پا رہی ہے۔ اس کی وجہ بنیادی طور پر ہندوستان جیسے جمہوری ملک کی وہ سیاست ہے جو اوپر سے سماج واد کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے مگر اندر اندر اسے قومی اور بین الاقوامی اجارہ داری گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں تراب زیست میں ایک اور سو کا فرق بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ اجتماعی ثنویت ہے جس کے انگنت روپ سامنے آتے جاتے ہیں اور جس کے نتیجہ میں کلچر کا وہ شعور جاگتا ہے جو اسے نمو پذیر بنانے کے بدلے اسے پیچھے کی طرف لیجانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اور اس میں بھی اس کی سمجھ سے زیادہ جذبے کو دخل ہوتا ہے۔ نئی دنیا کا سفر جاری ہے لیکن کلچر کا زادِ راہ کہیں کھو گیا ہے

یہ گمشدگی ہی اصل مسئلہ ہے اور اسی وجہ سے نئے افسانے کے خالق اور اس کے قاری میں ہم آہنگی نہیں ہو پا رہی ہے۔ نئے افسانے کے خالق اور اس کے قاری کے درمیان کی خلیج پاٹنے کے لیے نقادوں کی کوششیں بھی ہنوز لاحاصل رہی ہیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ آرٹ کو سمجھنے، برتنے اور پرکھنے کا سلیقہ جمالیاتی طور پر نامیاتی ہوتا ہے۔ یہ سلیقہ

تہذیب کے کڑے کوس طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے ۔ اور حاصل کیا جاتا ہے۔ کہانی کے ارتقائی سلسلے کو اگر وجۂ خاص میسر رہے تو آج کا افسانہ ہماری فہم میں آسکتا ہے ۔ خالدہ اصغر کی کہانی "سواری" یا انور عظیم کا "دوسرا قصہ" رات کا" یا احمد یوسف کا "خطِ منحنی" یا اقبال مجید کا "دو بھیگے ہوئے لوگ" یا اقبال متین کا "آگہی کے ویرانے" یا رتن سنگھ کا "آخری اُداس آدمی" یا سریندر پرکاش کا "رونے کی آواز" اپنے فنی سلوک اور اپنے ڈھانچے کے اختلاف کے باوجود قاری کے ادراک کا حصہ بن سکتے ہیں ۔ کیوں کہ یہ سارے افسانے نئے نئے سے ہونے کے باوجود مختصر افسانے کی ایجاد کے بنیادی تحرک کا نتیجہ ہیں ۔ رتن سنگھ کے افسانے میں محض تاثر کی کیفیتِ مختصر کے باوجود ایک انتظام ہے ۔ کچھ ایسی ہی کیفیت مگر کچھ شدت کے ساتھ انور سجاد کے افسانہ "زندان نامہ" میں ملتی ہے ۔ انور عظیم کے افسانہ میں اندر کی دنیا کا جلتا ہوا دیومالائی ہر کا عالم زندگی کے پورے نظام میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے ۔ خالدہ اصغر کی "سواری" میں ہیبت ناک آسمانی شعلہ سامانی سے زندگی کے پاٹ کو اندر اندر ہموار کرنے کی کوشش ملتی ہے ۔ احمد یوسف کے "خطِ منحنی" کے کیمرے کی آنکھ میں زندگی کے کرب کو ایک خاص نکتہ پر پہنچ کر ان کرنوں کو سرایت کر دینے کی صلاحیت موجود ہے ۔ رام لال کے عبرت زدہ لڑکا کی علامت میں جذبۂ مقاومت کی علامت پوشیدہ ہے ۔ سریندر پرکاش کے رونے کی آواز میں سماجی رشتوں کا طنز بھرپور ہے ۔

یہ افسانے ہماری فہم کا اُس وقت حصہ بن سکتے ہیں جب ہم زمان و مکاں کے کلاسیکل تصور سے ہٹ کر اندر کی دنیا کو بھی ایک نظام سمجھ لیں بشرطیکہ یہ ہے کہ اندر کی دنیا ساعت کے تصور سے بے نیاز ہو ۔ جدید سائنس نے ساعت کے قدیم تصور کو توڑ کر کوئی گناہ نہیں کیا ہے بلکہ یہ ہر لحظہ نئے طور، نئی برقِ تجلی کی ہمک کا نتیجہ ہے، ہمیں اسے مثبت طریقے پر قبول کرنا چاہیے اور نئے افسانے کو اسی کی روشنی میں برتنا اور پرکھنا چاہیے ۔ ❋❋

بقیہ اقبال اور ترقی پسندی

اور چین میں خودی کی بیداری کو پیش کرتی ہے ۔

دیوتا اب فلک پہ نہیں آسمان کا
زمیں پہ نہیں اژدہا بحر و بر کا
میں خود دیوتا ہوں زمین و زماں کا
میں خود اژدہا دیوتا خشک و تر کا
مرا راستہ چھوڑ دو کہسارو !
کہ میں آگیا ہوں
کہ میں آگیا ہوں

چین کی آزادی اور اس چینی نظم کی تخلیق سے کئی برس پہلے علامہ اقبال یہی بات اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں کہہ چکے ہیں ۔ ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ ❋❋

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو

ریاض صدیقی
پاکستان

ترقّی پسند دبستان کے زیر اثر حیات وکائنات کے پیچیدہ مسائل و امکانات کی عکاسی کرنے والی شاعری نے جو عہد آفریں ذہن پیدا کئے تھے جاں نثار اختر ان میں سے ایک ہیں ۔ جاں نثار اختر کا لب ولہجہ اور سرمایۂ اظہار قابلِ توجہ حوالے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ جاں نثار غزل گوئی کی قلم رو میں ناقابلِ تردید مقام کے مستحق ہیں کیوں کہ غزل گوئی کی بنا پر وہ ایک انقلابی اور متحرّک نسل کے سفر کی تکمیل کے بعد دوسری جوان نسل کے قافلے سے قدم ملاکر چلنے میں کامیاب رہے ہیں ۔ ۱۹۶۰ سنہ ء کے بعد آنے والے عرصے میں جاں نثار کو جدید شاعر کی حیثیت سے ان کی غزلوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے ۔ جاں نثار اختر کے اس دعوے میں کہ " ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو " بڑی حد تک صداقت ہے ؎

آئے کیا کیا یاد نظر جب پڑتی ہے دالانوں پر
اس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشن دانوں پر

واقعہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

سجے ہوئے ہیں کھلونے سبھی دکانوں پر
نہ جانے کس پہ ترا دل مچل گیا ہوگا

اِن اشعار کی معنویت ' لطافت اور رمزیت کا راز نئے لفظوں کے انتخاب میں پنہاں ہے ۔ شعری ہیئت میں نئی لفظیات کی موزوں پیوند کاری بذات خود تخلیقی عمل کا ایک دقت طلب مرحلہ ہے ۔ ان اشعار میں ایک باطنی حِسّی کیفیت کا اظہار نئے لفظوں کے وسیلے سے ہوا ہے ۔ یہ نیا پن بامقصد جدیدیت کی اس تحریک کا ردِعمل ہے جس کو نو ترقی پسندیت (NEW - PROGRESSIVISM) کا نام دیا جاسکتا ہے ۔ آل احمد سرور نے اسی پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

" جب جاں نثار فلموں کی دنیا کی رنگینی میں کھوئے ہوئے تھے تو کچھ لوگوں کا یہ خیال ہو چلا تھا کہ وہ اس دور کے تازہ ترین میلانات سے اور نئی فکر اور نئی حسیت سے لازماً دور ہو گئے ہوں گے مگر اس شاعر کا عجوبہ یہ ہے کہ اس کی نگاہیں دِل کے داغوں پر رہیں اور دلِ نئی نسل کے احساس کے ساتھ دھڑکتا رہا " (پچھلے پہر ۔ ص ۶ ۔ مطبوعہ لاہور)

روایات سے بغاوت اور ادب میں سماجی مقصدیت کی مسلک سے وابستگی کی بنا پر ایک عرصہ تک جاں نثار غزل سے گریزاں رہے ۔ حالاں کہ ان کی ذہنی پرورش کلاسیکی غزل کی آغوش میں ہوئی تھی ۔ ان کے والد مضطر خیرآبادی شوخ اور رنگین غزل گو کی حیثیت سے جانے جاتے

تھے ۔ جاں نثار نے علی گڑھ کی تعلیمی زندگی کے دوران جب شعر کہنے شروع کیے تو اسلوب واداکی حد تک مضطر خیرآبادی کی پیروی پر اکتفا کیا لیکن ترقی پسند دبستان سے وابستہ ہوتے ہی انہوں نے شیوۂ غزل گوئی ترک کر دیا ۔ علی گڑھ کے شب وروز ان کے ذہنی ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ کیوں کہ یہی وہ عرصہ تھا جب برصغیر کی تاریخ میں شعور وآگہی کے آغاز ۔ آزادی وانقلاب کی تحریکات اور جدید عقلی علوم سے اخذ واستفادہ ایک سماجی عمل بنتے جا رہے تھے ۔ خارجی حالات کے تیز وتند بہاؤ نے جمہوری حقوق کی بازیافت کے جذبے، آزادی وخودمختاری کے حصول کی خواہش اور روسی انقلاب کے اثر کی گرفت میں اضافہ کر دیا تھا ۔ پرولتاری انقلاب کے بعد برصغیر میں نیم جاگیردارانہ معاشرت کی باقیات اور سرمایہ دارانہ طرزِ معیشت و اخلاقیات کے خلاف ردِ عمل کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی ۔ جاں نثار اختر ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اس خارجی فضا کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے ۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کے بعد والے طویل عرصے میں ان کی تخلیقی کاوشوں کا اظہار آزاد اور پابند نظموں کے ذریعے ہوتا رہا ۔ ان کی نظمیں گرلز کالج کی لاری ۔ بگولے ۔ کون سا گیت سنو گی انجم ۔ امن نامہ ۔ خاکِ دل اور آخری ملاقات ۔ اس دور کی نمائندہ نظموں میں تھیں ۔ لیکن شعری دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے جس جذبِ دروں اور فعالیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان نظموں میں کم کم ہے ۔ اور آخری دور کی غزلوں میں یقیناً پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔

۱۹۵۲ء کے بعد ترقی پسند تحریک بعض داخلی تضادات کی بنا پر تعطل اور انتشار کے بحران سے دوچار ہوئی یہی وہ زمانہ ہے جب جاں نثار اختر دوبارہ غزل کی بستی میں واپس ہوئے ۔ بحران کے بطن سے جو نئی شعری نسل ابھر کر سامنے آئی تھی وہ مکمل طور پر جدیدیت کی روایت سے متاثر تھی ۔ یہ ملارمے ۔ رانبو ۔ ایزرا پاؤنڈ ۔ ایلیٹ ۔ سارتر اور باؤلیر کی پیروی کرنے والی نسل تھی ۔ اس نسل کے مجموعی تجربے کم و بیش ۱۹۶۰ء تک سابقہ ترقی پسند دبستان کی ضد میں ردِ عمل بن کر مقبول ہوئے ۔ ان تجربوں ہی کے زیرِ اثر غزل کی روایت بھی نئی لفظی تنظیم ۔ جمالیاتی آرائش اور حسیت سے ہم رشتہ ہوئی ۔ جاں نثار نے متانت اور حکمت کا سہارا لیکر غزل کی نئی روایت کو ترقی پسندانہ فکر سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔ اس طرح انہوں نے ترقی پسند نظریۂ ادب کو بڑھتے پھیلتے حال کا ترجمان بنا کر ماضی کی روایت بننے سے بچالیا ۔ جاں نثار کی غزل گوئی برصغیر میں ترقی پسند ادبی دبستان کے احیاء کا سبب بن گئی ۔ اور ۱۹۷۰ء کی باغی نسل نے دوبارہ ترقی پسند شعور سے اپنے رابطے قائم کر لئے ۔ جاں نثار کی غزلوں میں ایسی داخلی توانائی اور جمالیاتی حس ملتی ہے جو تہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ کاٹ کرنے والی نشتریت بھی رکھتی ہے ۔ ان غزلوں میں رمزیت کا نئے تیور کے ساتھ عیاں ہوا ہے ۔ ؎

گذر گیا ہے کوئی لمحۂ شرر کی طرح
ابھی تو میں اسے پہچان بھی نہ پایا تھا

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے

جدیدیت سے جاں نثار کا استفادہ کسی مفاہمت یا احساسِ شکست کی نشاندہی نہیں کرتا ان کی غزلوں کی تہہ میں سماجی مقصدیت اور نظریات پر اعتماد واعتبار کی کیفیات اپنے معنی بتلاتی ہیں ۔ ؎

فاصلہ چند قدم کا ہے منالیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو

ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے
ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے رنگی ہے

جاں نثار اختر نے جدیدیت کی مریضانہ روش اور فنی و معنوی بددیانتی (CORRIPTION) سے پہلو بچا کر الفاظ واظہار کے صحت مند تجربوں کو راہ دی ہے ۔ البتہ انہوں نے "سابقہ" ترقی پسند تحریک کی بعض کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے بامعنی اور فعال حسیت کو نئے ماحول اور ارضی تقاضوں کے تحت نئی سمت عطا کی ہے ۔

حسیت اور امیجری کی تہہ در تہہ رنگا رنگی کے باوجود جاں نثار انقلاب اور تغیر پذیر اجتماعی اقدار کے عمل سے دامن کشاں نہیں ہیں، ہاں انہوں نے اپنے عہد کے جملہ سماجی اور تہذیبی رجحانات کے تحت اس فاصلے کو تلاش ضرور کیا ہے جو برصغیر میں عملاً انقلاب کے راستے کو روکے ہوئے ہے۔

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھئے
ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہوئے مجھے

ان فاصلوں سے پیدا ہونے والا کرب اکثر شہروں میں دکھائی دیتا ہے اور یہ کرب نظریۂ حیات سے استواری اور شرط وفاداری پر دلالت کرتا ہے۔ اسی کرب کی قوت اور باطنی تپش نے جاں نثار کو نئی سمتوں اور وسعتوں کی تلاش پر مائل کیا اور وہ اپنے متعین افکار و خیالات کے ہمراہ نئی نسل کی اس انجمن میں پہنچے جہاں لوگ دو زمانوں کے بیچ بٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ؎

شعر و فن کی سجی ہے نئی انجمن
ہم بھی بیٹھے ہیں کچھ نوجوانوں کے بیچ

ایک اور اضطراری کیفیت جو کسی حد تک ترقی پسند اور سائنسی نقطۂ نظر کی کاٹ کرتی ہے جاں نثار کی غزلوں میں نمایاں ہوئی ہے۔ یہ کیفیت دیہی کلچر اور فضاؤں سے شہری کلچر کی پیچیدگی —— (COMPLEX) کے تصادم سے اُبھرنے والا تضاد ہے جو شاعر کو بار بار دیہی کلچر کے حوالے سے یادوں کی اور خوابوں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ ان غزلوں میں نیم حزنیہ لب و لہجہ ان محرومیوں کی نشان دہی کرتا ہے جو شاعر کے باطن میں گھر کر گئی ہیں۔ تاہم شاعر محرومی کی فضا سے اپنے شعور کو آلودہ نہیں ہونے دیتا ہے۔ اور ایک سوچے سمجھے فیصلے کے تحت یقین و مسرت کے لمحوں کو گرفت کرتا ہے خود اختیاری (SELF CONTROLLED) جذبات کا یہ رویّہ ہمیں کم شاعروں کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان غزلوں کے داخلی آہنگ اور ان کی تاثراتی گرفت میں نیم سرد موسموں کا حسن اور بہاروں کی مہک محسوس کی جا سکتی ہے۔ نظموں اور ابتدائی دور کی غزلوں میں موضوعات کی در آمد خارج سے باطن کی جانب تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد والی غزلوں میں موضوعات کو احساس کی باطنی حرارت نے لطیف تر بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاں نثار نے اپنے معاصر شاعروں کی طرح خود کو دہرانے والا عمل اختیار نہیں کیا۔ اس میلان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی، کائنات اور فطرت کی نئی اور تغیر پذیر معنویت سے آگاہی بھی حاصل کرتے ہیں اور اس کی لذتوں اور رعنائیوں سے رس بھی حاصل کرتے ہیں۔ جسم و جاں کے نئے رشتوں اور نئی لطافتوں کا ادراک سنہ ۱۹۶۰ء والی غزلوں کا غالب رنگ ہے۔ قدیم و جدید اساتذہ کے یہاں جسم و جاں کے تعلق سے رونما ہونے والی حسیت ہمیں مصحفیؔ، حسرتؔ اور فراقؔ کے یہاں ملتی ہے۔ فراقؔ کے یہاں نفسیات کی گہرائی۔ حسرتؔ کے یہاں لذت اور مسرت کی فضا اور مصحفیؔ کے یہاں جسمانی لذت کی حسرت کا اظہار ہوا ہے۔ جاں نثار کے یہاں حسرت کا نشاطیہ اور مسرت آفریں رنگ زیادہ گہرا ہے۔ ؎

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان
تجھ کو دیکھوں تو مجھے پیاس لگے

آؤ ہم جسم کی شمعوں سے اُجالا کر لیں
چاند نکلا بھی نکلے گا ذرا رات گئے

سرمایہ دارانہ شہری اور صنعتی زندگی کی سطحیت، کھوکھلے پن اور تاجرانہ رجحانات کی بنا پہ وجود کی بے معنویت اور تنہائی کا احساس جو عموماً بورژوائی اور نیم بورژوائی طبقوں میں در آیا ہے۔ جاں نثار کے یہاں اس کی طرف جانے کا میلان بہرحال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

جو اپنی ذات سے اک انجمن کہا جائے
وہ شخص بھی مجھے تنہا دکھائی دیتا ہے **

احمد ندیم قاسمی

مدیر "فنون" ۔ ۴۷، انارکلی، لاہور (پاکستان)

رہنما

رات جنگل میں آئی
تو چیتے کی آنکھوں نے
دو مشعلیں یوں جلائیں
کہ میں راستے سے بھٹکنے کی عیاشیاں
بھول بیٹھا

فشار

پھول جب کھل چکا تو کہنے لگا
اب مرا حسن میرے بس میں نہیں
اب میں اپنی بھی دسترس میں نہیں

حرمت الاکرام

رام باغ ۔ مرزا پور (یو ۔ پی)

ریت کا بھکاری

آبجوئے رواں!
(خلق تجھ کو وفورِ عقیدت میں کہتی ہے ماں)
تیرے ذوقِ سخاوت کا فیضان مشہور ہے
کتنی سیرابیاں ـــ کتنی شادابیاں
تجھ سے منسوب ہیں داستاں داستاں
یہ سفینوں کے طغیان جو بادباں
ساحلوں کی ہوا سے لپٹتے ہوئے
جھومتے: ایک البیلے ماضی کا شیریں تصور لیے
تیرے چرنوں سے لپٹی ہوئی بستیاں
(جھونپڑوں، کوٹھیوں، باغوں کی کہکشاں)
وجہِ تسکینِ جاں تیری امواج کا انگبیں
فکر میں ڈوبے، اونچے شوالوں کی پرچھائیوں کی امیں
اے مرے شہر کی آبجوئے رواں!
لے کر آیا ہوں اک التجا
مجھ کو بھی ہو عطا
ریت، تھوڑی سی ریت اور کچھ بھی نہیں
چاہتا ہوں کہ میں بھی بنا لوں محل

زاہدہ صدیقی

مدیرہ ماہنامہ "تحریریں" چوک اُردو بازار، لاہور (پاکستان)

سفر رائیگاں

خدایا!

اگر

آتے کل کی خوشی کا تصور

حقیقت نہیں ہے

فقط اک سراب حقیقت ہے

تو کس لیے

اس کو پانے کی خواہش

مرے دل میں بڑھتی چلی جا رہی ہے

خدایا!

اگر آتے کل کی خوشی کا تصور

مرے واسطے اجنبی ہے

تو اس کی طلب میں

اذیت کا سارا سفر رائیگاں تو نہیں ہے!

طلب کا ہر اک مرحلہ بے نشاں تو نہیں ہے!!

پرتپال سنگھ بے تاب

معرفت منوہر لال دل ۔ جیولرس فائنانس، ۵ رگھوناتھ بازار ۔ جموں توی (کشمیر)

ایک نظم

ورق ورق

بکھر کے

آندھیوں کے ساتھ اُڑ گیا

ساحلوں سے یہ سفر

سمندروں کی سمت تھا

سفید ریش وہ بزرگ

جو قلم بدست تھا

پکارتا رہا تمام عبث

سفینہ دور دور تک

بلندیوں کو اور اندھی بستیوں کو

قید کرنے جا رہے تھے

لفظ جسم کی حدوں کو توڑ کر

ہوا کے ساتھ ہو رہے تھے

اور وہ ہوا........

ہوا جو بے قرار تھی

ہوا جو بے ثبات تھی

سفر میں تھی مگن

تمام حادثوں سے بے خبر۔

اسماعیل راز

نزد پیلا پمپ ۔ آگرہ روڈ ۔ مالیگاؤں (ناسک)

ہم سنہرے کل کی جانب بڑھ رہے ہیں

کتنی تیزی سے
ہم سنہرے کل کی جانب بڑھ رہے ہیں
اور ہمارے ساتھ ساتھ
جانے کیا کیا بڑھ رہا ہے
دال اور گیہوں کے دام
تیل کا بھاؤ کہاں تھا
آج دیکھو تو کہاں پر ہوگیا
(زندگی کی ہر ضروری چیز
گھٹتی جا رہی ہے)
خودکشی کے واقعات
روز بڑھتے جا رہے ہیں
جو غریبی دور کرنے آئے تھے
آج وہ جانے کہاں گم ہو گئے
مفلسی، فاقہ کشی، بے روزگاری
گاؤں اور شہروں میں بڑھتی جا رہی ہے
کتنی تیزی سے ـــــ
ہم سنہرے کل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

اکبر مرزا

۱۶۴ر ایم ۔ ایچ ۔ بی ۔ کالونی ۔ مالیگاؤں (ناسک)

زندگی کا کرشن

زندگی
کھیتوں میں کھلیانوں میں
دہقانوں کے سینوں میں مچلتی زندگی
گاؤں کی پگڈنڈیوں پہ جھومتی گاتی ہوئی
اور پنگھٹ پہ کھنکتے قہقہوں میں
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے
کوہساروں کی طرح
حوصلوں میں، آرزوؤں میں، اُمنگوں میں بسی
ہے رُخِ مزدور پر اس کی جھلک
کارخانوں کے دھڑکتے دل میں ہے
اور تاریکی کا سینہ چیر کر، روشنی کا نور کا پیکر بنی
نفرتوں سے دور ہے
ظلم و ستم کے سامنے سینہ سپر
امن و خوشحالی کے سائے میں پلی
موت کی سفاکیوں سے بے خبر
ہے رواں انسانیت کے نام پر

زندگی! ـــــ محسن ترا اور مہرباں
ہاں وہی تیرا نقیب و ترجماں
با عمل، انسانیت کا راہبر
کرشن بن کر چھا گیا تھا ہر طرف
آج لیکن سب کو روتا چھوڑ کر
چل دیا ہے تجھ سے ناطہ توڑ کر

نیلمؔ ہاشمی
حیدرآباد (دکن)

بددعا

تم ذرا رکو تو سہی !
یہ مہکتے گیسو دہکتے عارض
نشیلی آنکھیں لرزتے لب
یہ پتھر کا وجود
یہ سب امانتیں میری بھی تو ہیں
تم ذرا رکو تو سہی ــــــ !!

میں وحشی ہرنی بھاگتی رہی
ٹھوکریں کھاتی رہی
پھر بھی ایک پل
قدم میرے رکتے نہیں
پیچھے مڑ کر بھی دیکھا نہیں
کہ مجھے علم ہے
اگر میں رک گئی ایک پل
پیچھے مڑ کر تکنے لگی
تو میں پتھر کی بن جاؤں گی !!

تنہا تماپوری
پوسٹ رنگم پیٹ ۵۸۵۲۲۰ ۔ گلبرگہ (کرناٹک)

اگر گونگے نہیں ہو تم

یہاں پر
وقت کی ان بے جہت نظروں میں ہم نے
ہر مسافت کو تعفن کے کفن میں منجمد پایا
حیات اک ماتمی لمحوں کا بر فیلا بچھونا تھی
اُجالوں نے دشاؤں کے مچانوں پر اُکھڑتی سانس کے جالے تنے تھے
کپکپی پہچان تھی تاروں کے ہونٹوں کی ......
مگر ــــ ہنستے ہوئے منظر بچھائے گا زمیں پر ــــ کون ؟
سنو !
یہ کس نے خاموشی کے دروازوں پہ دستک دی ؟
کہو : کیا تم نہ بولو گے ؟ !
سکوت اچھا ہے ــــ بہروں میں ــــ اگر گونگے نہیں ہو تم
مجھے یہ بھی شبہ ہے اب
یہاں پر
وقت کی پہچان سے انکار کر دے گی زمیں
جو میرے قدموں میں ابھی سوئی ہوئی سی ہے
زمیں کے جاگنے سے پہلے توڑ دو تم سکوت اپنا
کہو !
کیا تم نہ بولو گے !!

میرا، تیرا، اُس کا غم

(کرشن چندر ہی کے نام)

عابد سہیل
کپور مارکیٹ ۔ لکھنؤ ۱

باہر کی ساری دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ سڑک وہی تھی لیکن ذرا زیادہ کشادہ۔ پیدل چلنے والوں، سائیکل سواروں، اسکوٹروں اور موٹر رکشاؤں پر یک بیک نظروں سے اوجھل ہو جانے والوں اور خوبصورت کاروں پر تنہا، دوستوں، عزیزوں اور محبوباؤں کے ساتھ سفر کرنے والوں کی بھیڑ اتنی ہی تھی جتنی ہمیشہ ہوتی تھی بلکہ شاید اُس سے کچھ زائد لیکن ہر ایک چہرہ جیسے خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ وہ ہوٹل جہاں میں دفتر سے اُٹھ کر کبھی کبھی دن میں کھانا کھانے چلا جاتا ہوں اتنی دور تو ہے ہی کہ ایک سگریٹ کا لطف لیا جا سکے، سامنے والی پان کی دوکان کا رُخ کیا تو حیران رہ گیا۔ بغیر لگے پانوں کی ڈولیاں ایک طرف سلیقہ سے جمی ہوئی تھیں، کتھے چونے کے برتن چاچم چمک رہے تھے۔ سنگِ مرمر کی وہ سِل جس پر پان لگا کر پھیلا دیئے جاتے تھے، پانوں کی سبزی کے نیچے بلکہ پیچھے سے سفیدی جھلکا رہی تھی۔ دوکان کا مالک اور ملازم صاف سُتھرے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ دو تین خریدار جو پہلے سے موجود تھے اور ایک خریدار جو میرے بعد آیا نہایت عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

دوکاندار نے بے حد سلیقہ سے پان لگایا، الائچی ڈالی اور خوبصورت سا بیڑا بنا کر ایک گاہک کے حوالہ کیا تو اس نے ایک سکہ اس کی طرف بڑھا دیا اور روانہ ہو گیا۔

"بابوجی ــــ" دوکاندار نے آواز دی۔

"پیسے ــــ"

"پیسے دے تو دیئے"

"جی ہاں! لیکن باقی تو لیتے جایئے"

وہ واپس لوٹا۔ دوکاندار نے باقی پیسے اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے، دونوں نے ایک دوسرے کو پھر مسکرا کر دیکھا اور دوکاندار نے مجھے حیران و پریشان دیکھ کر پوچھا۔

"بابوجی پان؟"

"نہیں ــــ سگریٹ"

"کونسی؟"

میں نے اپنی بلکہ اپنی جیب کی پسند کی سگریٹ کا نام لیا۔

اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"اب کہاں ——— فلٹر پیجیے"

"لیکن"

"وہ بھی اتنے ہی میں ملا ہے"۔ اس نے کہا۔

میں نے اتنے ہی پیسے دیے، فلٹر سگریٹ لی، دوکان کے اس کونے کی طرف جہاں ایک سلگتی ہوئی رسی سگریٹ جلانے کیلئے لٹکی رہتی تھی بڑھا تو وہاں رسی کے بجائے، طاق میں ایک خوبصورت لائٹر رکھا تھا۔ میں نے سگریٹ جلائی، لائٹر کو ایکبار ہتھیلی میں رکھکر دیکھا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اب میں کچھ کچھ الجھنے لگا تھا۔ ہر شخص خوش و خرم تھا، مسکرا رہا تھا، ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا۔ میں نے مایوس ہوکر پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو سناٹے میں آگیا۔ پیشانی کی دبیز لکیریں غائب تھیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ شاید لکیریں میری پیشانی سے اٹھ کر کسی دوسری پیشانی پر چپک گئی ہوں ادھر اُدھر دیکھا لیکن ان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آس پاس کی ہر پیشانی سادہ اور سپاٹ تھی، بلکہ خوشی سے دمک رہی تھی۔

میرے لیے یہ دوسرا صدمہ تھا۔ یہ لکیریں میں نے کتنی فکریں پال پال کر اور کتنی مصیبتیں جھیل جھیل کر اپنی پیشانی پر جمائی تھیں لیکن یہ آج بلکہ ابھی ابھی بغیر کسی سبب کے غائب ہوگئی تھیں اور کربناک ماضی سے میرا سارا رشتہ ہی کٹ گیا تھا۔ پہلا صدمہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب میں نے پان کی دوکان پر اُن لوگوں کو بھی جو عام طور پر نہایت گندے، میلے، چیکٹے کپڑے پہنے رہتے تھے صاف ستھرے بلکہ اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ اس بات پر مجھے اسی قدر حیرت ہوئی تھی بلکہ غصہ آیا تھا کہ میں نے اپنے کپڑوں کی طرف بھی نظر نہ کی تھی۔

میں ان دونوں صدمات سے بوجھل ہوٹل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک سائیکل کا اگلا پہیہ میری ٹانگ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس جگہ ہاتھ پھیرا جہاں سائیکل کا پہیہ ٹکرایا تھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ میرا دایاں ہاتھ نہایت چکنی کھدی زین کی پتلون پر پھسل رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے جوتوں سے لیکر قمیص تک نظر ڈالی تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ میرا جوتا چمکدار، نیا اور بہت خوبصورت تھا، پتلون نہایت عمدہ سلی ہوئی تھی اور اس پر ایک بھی شکن نہ تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی قمیص کھدی زین کی پتلون اور ان نئے جوتوں پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ "یاالٰہی آخر یہ کیا ماجرا ہے؟"۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اسی دوران جو میری نظر اپنے ہاتھ کی گھڑی پر پڑی تو اسے پہچاننا بھی مشکل ہوگیا۔ شیشے پر کے نشان غائب تھے، پٹا سیاہ اور خوبصورت تھا اور فریم بھی جگمگا رہا تھا۔

سائیکل سوار نے میری طرف دیکھا اور کہا ———

"مجھے واقعی بہت افسوس ہے"۔ اُس کی آواز صرف حلق سے ہی نکل رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں"۔ میں نے کہا تو اپنی ہی آواز مجھے دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس موقعہ پر یہ جواب تو نہیں دیا جاتا۔ "اندھے ہوگئے تھے کیا؟" شاید زیادہ مناسب رہتا لیکن نہ جانے کیسے میرے منہ سے "کوئی بات نہیں" نکل گیا۔

میں نے دوبارہ اپنے پتلون کی مہری کی طرف نظر کی تو جہاں پر سائیکل کے پہیے نے تقریباً ایک فٹ لمبا نشان بنا دیا تھا وہاں نہ صرف یہ کہ اب کوئی نشان نہ تھا بلکہ کوئی شکن تک نہ تھی۔

سائیکل سوار مسکرایا تو میں بھی مسکرا دیا، مجھے اپنی اس مسکراہٹ پر ایکبار پھر حیرت ہوئی۔ میں نے اس مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کی تو ایکبار پھر مسکراہٹ میرے ہونٹوں سے پھوٹ پڑی اور سائیکل سوار بھی ہنستا ہوا دوسری سمت روانہ ہوگیا۔

میں نے دو چھوٹی چھوٹی سڑکیں پار کیں اور اسی سڑک کی طرف بڑھا جس پر ذرا آگے بڑھ کر وہ ہوٹل تھا جس میں کبھی کبھی دن کا کھانا کھالیتا تھا کہ ایکدم سامنے جو نظر پڑی تو ایسا لگا کہ جیسے میں اسی جگہ پہنچ گیا ہوں جہاں وہ ہوٹل تھا۔ آس پاس کے مکان بلکہ حد یہ ہے کہ پارک تک وہی تھے ہاں ایسا لگتا تھا جیسے ساری عمارتوں پر ابھی ابھی سفیدی کی گئی ہو۔ پارک

میں ہر موسم کے پھول ایک ساتھ کھل رہے تھے ۔ ان میں گلاب بھی تھے ۔ بیلے بھی، جوہی بھی تھی موگرا بھی، گیندے بھی اور برسات آخر اور جاڑوں کے شروع میں کھلنے والے نو کی پھول بھی ۔

لیکن وہاں ہوٹل کے بجائے یا جہاں ہوٹل ہونا چاہیے تھا ایک خوبصورت سا مکان بنا تھا۔ دروازہ پر سرخ رنگ کا خوبصورت پردہ پھڑ پھڑا رہا تھا ۔ کھڑکیوں پر بھی رنگ برنگے پردے ٹنگے تھے ۔ اسی لمحہ دروازہ کے پردے کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور میری بہن نے پردہ میں سے منہ نکال کر کہا ۔

"بھائی صاحب آئیے!"

اب میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ میری چھوٹی بہن تو بمبئی میں رہتی ہے ۔ اس کا شوہر وہاں پائلیٹ ہے، وہاں اس کا ایک چھوٹا سا خوبصورت اور سجا سجایا مکان ہے ۔ آخر وہ یہاں کیسے آگئی؟ — اس کا مکان یہاں کیسے آگیا؟ اندر داخل ہوا تو میرے دونوں بھانجے اپنے اپنے کھلونے چھوڑ کر مجھ سے چمٹ گئے ۔ چھوٹا ہمک کر میری گود میں آگیا اور بڑا میری ٹانگوں سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا ۔ اور بولا ۔

"ماموں جان میری ٹافی کہاں ہے؟ نکالئے جلدی سے" ۔

یہ جاننے کے باوجود کہ دونوں جیبیں خالی ہیں، میں نے ہاتھ پتلون کی بائیں جیب میں ڈالا تو وہاں بہت سی ٹافیاں موجود تھیں ۔ میں نے ٹافیاں میز پر ڈھیر کر دیں تو چھوٹا جھٹ پٹ میری گود سے اترنے لگا اور بڑا جو اب تک میری ٹانگوں سے چمٹا کھڑا تھا ٹافیوں پر ٹوٹ پڑا ۔ میز کے دوسرے کونے پر میری چھوٹی بہن کھڑی مسکرا رہی تھی ۔ ایک کونہ پر چند پلیٹیں سلیقہ سے لگی تھیں ۔ چند پیالوں میں جو ڈھکے ہوئے تھے گرما گرم کھانا رکھا ہوا تھا ۔ جس میں سے بھاپ کے ساتھ خوشبو بھی نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی ۔

میں نے واش بیسن سے منہ ہاتھ دھویا ۔ کرسی کی پشت پر پھیلے ہوئے تولیہ سے ہاتھ پونچھا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا ۔ میری بہن نے بھی کھانے میں میرا ساتھ دیا ۔

دفتر واپس پہنچا تو صرف آدھ گھنٹہ بیتا تھا جبکہ روزانہ ایک گھنٹہ کے بجائے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے لگ جاتے تھے اور دفتر آتے ہی یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ جو کچھ کھایا تھا وہ یا تو پیٹ میں پہنچا ہی نہیں تھا یا واپس آنے میں ہضم ہو گیا تھا ۔ کئی لوگ مجھ سے پہلے ہی واپس آچکے تھے ۔ باقی ایک ایک دو دو کر کے واپس آرہے تھے ۔ نہ کسی کے چہرے پر جھلاہٹ تھی نہ کوئی پریشانی ۔ ہم میں سے کسی نے نہ کسی ایسے شخص کی برائی کی جو وہاں موجود نہ ہو نہ کسی پر جملہ بازی، نہ کسی کا دل دکھانے کے لیے کوئی جملہ کہا، نہ کسی کی شکل و صورت کا مذاق اڑایا ۔ حد یہ ہے کہ ہم نے کسی دوسرے کے کام میں غلطیاں بھی نہیں نکالیں ۔

اسی دوران جب ہم لوگ کھانے کی چھٹی میں باہر گئے ہوئے تھے دفتر کی کایا پلٹ ہو گئی تھی ۔ عمارت تو رہی تھی لیکن اسے ہلکے گلابی رنگ سے رنگ دیا گیا تھا ۔ ٹوٹے پھوٹے حصوں کو سمنٹ لگا کر برابر کر دیا گیا تھا ۔ میز کرسیوں پر پالش کر دی گئی تھی ۔ بیچ والی میز پر کسی نے گلدان رکھ کر اس میں ایک گلدستہ سجا رکھا تھا ۔ باہر لان کی گھاس کاٹ کر برابر کر دی گئی تھی ۔ جھاڑ جھنکاڑ اکھاڑ کر پھینک دیئے گئے تھے، سارے پودوں کو تراش خراش کر سڈول بنا دیا گیا تھا اور ہر ہر پودے میں پھول ٹانک دیئے گئے تھے ۔

غرض دفتر کے اندر اور باہر ایک ہی سا عالم تھا ۔

میں نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا تو وہ میرے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔

"کہاں سے سلوائے، بہت عمدہ سلے ہیں اور رنگوں کا انتخاب تو بہت ہی خوب ہے ۔"

کسی نے کسی کے کپڑوں کی تعریف کی ہو یہ میرے دفتر میں پہلی بار ہوا تھا ورنہ ہم لوگ تو ایک دوسرے کی برائیاں کرنے کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ کسی اچھے پہلو پر ہماری نظر ہی نہ جاتی تھی ۔

"جی شکریہ" میں نے کہا اور سوچا کہ اس کی بش شرٹ اور پتلون کی جو یقیناً میرے کپڑوں سے اچھی اور بہتر سلی تھیں تعریف کردوں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اس وقت کی تعریف تو اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والی بات ہوکر رہ جائے گی ۔ خاموش ہو گیا ۔ لیکن اس نازک خیال، اس احساس، جذبہ کی اس گہرائی کا تجربہ میں نے پہلے کبھی کیوں نہ کیا تھا ۔ یہ احساس

کھو کھلے لفظ "شکریہ" سے کس قدر مختلف تھا۔ اسی وقت پسندیدگی کا اظہار نہ کرنے میں بھی کیسی پسندیدگی چھپی رہتی تھی۔ جس کا احساس الفاظ کے بغیر، اظہار کے بغیر دوسروں کو بھی ہوتا تھا اور یہ احساس ان کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی مسکراہٹ اور بات چیت کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن یہ سب ایکدم کیسے ہو گیا؟

اب یہ روزانہ کا دستور ہو گیا تھا۔ جہاں جس چیز کی ضرورت ہوتی مل جاتی۔ پیاس لگتی تو پاس ہی کوئی پیاؤ نظر آ جاتا۔ بھوک لگتی تو کسی بھائی، کسی بہن یا کسی دوست کا مکان قریب ہی ہوتا اور لطف یہ کہ میزبان منتظر بھی رہتا۔ گندگی، دلوں کے اندر اور دلوں کے باہر کی جیسے ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ دل کدورتوں سے صاف تھے، چہرے غموں سے پاک، آنکھیں مسکراہٹوں سے چمکتی ہوئی۔ اور پیشانیاں تردد سے خالی۔

یہ سلسلہ کئی دن، کئی ہفتے، بلکہ کئی مہینے چلتا رہا۔ زندگی خوشیوں سے کچھ اس طرح بھر گئی تھی کہ اب بہت سی پرانی باتیں یاد بھی نہ رہ گئی تھیں۔ زندگی میں ایسی ترتیب بلکہ خوش ترتیبی پیدا ہو گئی تھی کہ سارے تکون گولے بن گئے تھے۔ کوئی کسی سے ٹکراتا نہ ٹوٹتا۔ مخالف سمت سے تیز رفتار سے آتی ہوئی گاڑیاں آمنے سامنے آ کر اس طرح ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتیں کہ جیسے بس یہی ہونا ممکن تھا۔

ایک دن میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ یکایک نظر جو اٹھائی تو سامنے کرشن چندر کھڑے تھے، اپنی وہی مسکراہٹ لیے۔ جس میں کچھ غم بھی ہوتا ہے کچھ خوشی بھی، کچھ امید بھی، کچھ ناامیدی بھی، کچھ ماضی بھی، کچھ مستقبل بھی۔

میں ایکدم اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھیے، تشریف رکھیے" میں نے کہا۔

کرشن جی ذرا جھجکے "مجھے بہت جلدی میں ہوں، لیکن میں نے اصرار کیا تو بیٹھ گئے۔

دو ہفتے قبل جس دن ان کا خط آیا تھا میں اسی دن سے ذرا الجھن میں تھا۔ میں نے سوچا کہ جلدی میں ہیں کہیں میں وہ بات بھول نہ جاؤں اسلیے خیر خیریت دریافت کرنے کے بجائے میں نے اپنے دل کی الجھن ان کے سامنے رکھ دی

"اپنی بہترین کہانیوں کے انتخاب کی اجازت کا شکریہ!"

وہ مسکرائے ——

"لیکن دو سال قبل تو آپ نے کہا تھا کہ مجھے اپنی بہترین کہانیاں تو ابھی لکھنی باقی ہیں —— اس بیچ آپ نے ایسا تو کچھ لکھا نہیں"

"ہوں" —— کرشن جی نے کہا اور بے چینی سے اپنی کرسی میں کسمائے —— "اب لکھ بھی نہیں سکوں گا، مجھے جانا ہے۔ جلدی ہے"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا —— "علاج کرانے کے لیے لندن، ماسکو یا نیویارک؟"

"ارے بھائی، اچھا ہونا ہوتا تو یہیں ہو جاتا، ماسکو یا نیویارک جانے سے حاصل، ہاں مجھے ذرا جلدی ہے"

"لیکن آخر کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے ضد کی۔

"ارادہ" ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی۔ طنزیہ مسکراہٹ۔

"بھئی میں اپنے خواب لینے جا رہا ہوں"

"خواب" مجھے ایکدم خیال آیا کہ ادھر کئی ہفتوں، کئی مہینوں سے جو ہو رہا ہے وہ ایک خواب ہی تو ہے اور میں نے کہا —— "ایک خواب میں نے بھی، میرے بھی، ادھر ——"

میرا جملہ پورا بھی نہ ہو پایا تھا کہ کرشن جی کرسی پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"وہ خواب میں نے ہی بنے تھے، میں نے ہی بھیجے تھے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ یہ خواب بھی دیکھنا مشکل ہو جائے گا۔ میں اسی لیے جا رہا ہوں۔ جب یہ خواب لوٹ آئیں گے تو میں بھی لوٹ آؤں گا"

میں بھی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن آپ کب تک لوٹیں گے، اگلے مہینے، دو چار ماہ بعد، ایک سال، دو سال، یا پانچ سال بعد، کب آخر کب؟" میں نے کہا۔

"اب میں نہیں لوٹوں گا" انہوں نے کہا — "میری جگہ کوئی اور آئے گا کوئی دوسرا ہی، زیادہ سجل، زیادہ سُبک، زیادہ خوبصورت، زیادہ بامعنی خواب لیکر۔"

یہ کہہ کر کرشن جی مُڑے۔ میں بھی بڑی گول میز کا چکر کاٹ کر ان کے پاس پہونچ گیا۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھایا اور آہستہ آہستہ بولے۔

"دیکھو سہیل خواب دیکھنا کبھی بند نہ کرنا۔ خواب جہاں نہیں ہوتے وہاں اچھی، بڑی حقیقتیں بھی جنم نہیں لیتیں۔ وہاں ماضی بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔ حال بھی کربناک اور مستقبل بھی اندھیرا، تاریک اور سیاہ۔"

انہوں نے میرے شانے پر اپنے ہاتھ سے ذرا زور ڈالا —

اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی تھی۔ وہ بولے: "میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔ بلکہ بہت زیادہ جلدی میں ہوں۔ لیکن تم میری یہ بات اپنی عمر کے اور عمر میں اپنے سے چھوٹے کہانی کاروں تک ضرور پہنچا دینا۔"

میں نے ہمیشہ چمکتی رہنے والی ان آنکھوں میں اُداسی اور صرف اُداسی دیکھی تو آنسوؤں کی ایک لکیر میری آنکھوں میں بھی تیر گئی۔ کرشن جی نے بڑے پیار سے میرے کندھے پر اپنے ہاتھ سے زور ڈالا، ایک بار مُسکرائے اور بولے

"آنسوؤں کے بجائے ان آنکھوں میں خواب بھر لو —— اچھا رخصت۔"

میں اسی جگہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ انہوں نے تھوڑی دور جاکر ایک بار پھر میری طرف پلٹ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ اس جگہ تک بڑھتے چلے گئے جہاں آسمان جھک کر زمین سے مل جاتا ہے اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے ایکبار پھر آنسو پونچھنے کی کوشش کی تو انگلیاں پیشانی سے ٹکرائیں اور میں حیران رہ گیا۔

میری پیشانی کی دبیز لکیریں واپس آگئی تھیں۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو سب کچھ پہلے ہی کی طرح تھا۔ اس خواب سے پہلے کی طرح **

اِنسان عَلَیہِ السّلام

شاہد پرویز
کوارٹر نمبر ایف۔ بلاک ۳۴ بڑی مورسرائے، دہلی ۱۱۰۰۰۶

کئی شہروں سے فسادات اور لوٹ مار کی خبریں مل رہی تھیں۔ وہ سوچتا کہ خبروں کا کیا ہے ـــ خبریں تو اکثر جھوٹ ہوتی ہیں۔ لیکن اس بار اُس کے اپنے شہر میں فسادات شروع ہو گئے تھے۔

گلی کوچوں اور بازاروں میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں ـــ کچھ بالکل بے جان، بے رُوح ـــ کچھ چلتی پھرتی ـــ چیختی شور مچاتی۔ جو مرنے سے یا قتل ہونے سے بچ گئے تھے وہ دوسروں کو قتل کر رہے تھے۔

اُس نے اب تک جو کچھ سیکھا اور پڑھا تھا ـــ اُسے سب جھوٹ لگنے لگا۔ اُس کا ہر تجربہ اور پڑھی ہوئی کتابوں کا ہر لفظ جھوٹ بول لگ رہا تھا۔

پھر اُس رات جب نصف سے زیادہ شہر جھلس گیا۔ بہت سی عمارتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئیں ـــ یہاں تک کہ اُس کا اپنا گھر بھی ـــ تب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ خبریں نہیں سچ تھا۔

صحن میں ٹوٹی ہوئی الگنی پر اُس کی نظر گئی تو اپنی بیوی کی گلابی ساڑی کو دیکھتے ہی اُسے آج کی شام یاد آ گئی۔

اُس کی بیوی شام کو جب الگنی پر ساڑی پھیلا رہی تھی، اُس نے کہا تھا۔

"یہ وہی ساڑی ہے نا، جو پچھلے مہینہ میں نے تمہیں شادی کی تیسری سالگرہ پر لا کر دی تھی؟"

وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ بس اُس کا چہرہ ساڑی کی طرح گلابی ہو گیا تھا۔

ٹوٹی الگنی اور زمین میں گھسٹتی ساڑی سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں دالان میں پتھریلے فرش پر خون میں لت پت اپنی بیوی پر چلی گئیں۔ اُس کے پورے بدن پر اس وقت صرف دھجیاں تھیں ـــ بے دردی سے تراشی گئی ـــ ادھ کٹی چھاتیوں پر خون کے لوتھڑے جم گئے تھے۔ پاس پڑی اس کی ننھی منی گولڈی بیٹی کی ناف سے حلق تک چیرے شگاف سے بہہ بہہ کر ـــ ڈھیر سا خون بالکل گولڈی کی طرح معصومیت سے مسکرا رہا تھا۔

اُس نے سوچا کتنا بھرا پُرا گھر ہے ـــ سب ہی تو ہیں ـــ مگر یہ میری بہن ریشم کہاں گئی۔ ہر وقت کہیں نہ کہیں کسی کونے کھدرے میں گھسی کچھ پڑھتی رہتی ہے۔

پھر اُسے یاد آیا کہ ابھی چند لمحہ پہلے ہی تو اُس نے ریشم کا سر اوپر چھت پر دیکھا تھا۔ اُس کا خوبصورت چہرہ کیسا بھیانک لگ رہا تھا۔ کانوں تک چرے ہوئے گالوں سے پوری بتیسی کس بے ہنگم انداز میں جھانک رہی تھی۔

ضرور اُس کا دھڑ بھی یہیں کہیں ہو گا ـــ اُس نے سوچا۔

پھر وہ بہت ہمت کر کے اُٹھا — کتابوں کی الماری سے اُس نے ساری کتابیں نکال کر ایک چادر میں باندھ لیں۔

مذہب، فلسفہ، اخلاق اور دُنیا کے جس موضوع پر بھی اُس نے جو کچھ پڑھا تھا — وہ سب ایک پوٹ میں باندھ کر آنگن میں آیا۔ پھر بے جان لاشوں پر آخری نظر ڈالی اور گھر سے باہر آگیا۔

گھر سے باہر آکر اُس نے جو کچھ پڑھا تھا — وہ سب جو اُسے انسانیت، مذہب، رحم، اخلاق اور پیار کے نام پر سکھایا گیا تھا — سب کچھ ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا۔ یہاں تک کہ اپنے جسم سے کپڑوں کے نام پر آخری تار بھی اُتار کر اسی کنوئیں میں ڈال دیا۔

اُسے لگا جیسے اب وہ بالکل آزاد — ہلکا پھلکا اور بہت بلند ہوگیا ہو — نفرتوں اور محبتوں سے، ہر رشتے سے آزاد ہونا ہی تو بڑا پن ہے۔ اُس نے بہت زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ اب اُس کے بدن پر سینکڑوں آنکھیں کھُل گئی تھیں — وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی جو دوسرے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی جو دوسروں کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔

اُس کے قریب سے گذرنے والی بے شمار لاشوں نے چیخ کر کہا۔

"پاگل ہے پاگل — اسے مارو — مارو....." وہ ہنس پڑا۔

ہر لاش اُس پر پتھر برسا رہی تھی —

اچانک اُسے لگا جیسے کسی نے چیخ کر کہا —

"ارے یہ پاگل نہیں ہے"

سب لاشوں کے ہاتھ رُک گئے۔

"کون ہے یہ — کون ہے — کون ہے؟" بیشمار آوازیں آئیں۔

"مسلمنٹا ہے" کچھ بولے۔

"مسلمانی اُڑا دو سالے کی" کچھ لاشیں چیخیں۔

"نہیں — لالہ ہے لالہ۔ بودھی نوچ لو اس کی" کچھ اور چلائیں — "ارے نہیں —!" پھر کچھ نے شور مچایا۔

"سکھڑا ہے سکھڑا — سر مونڈ دو — داڑھی صاف کر دو"

"نہیں نہیں — کرسٹان ہے مردود" بہت سی تلواریں لہرائیں — "دیکھتے نہیں کراس ہے گلے میں"

پھر آوازوں کا ایک سیلاب آگیا۔ نیزوں کی انیاں چمکیں۔ چھُریاں اور کرپانوں کی زبانیں لپلپانے لگیں۔

اُس نے حیرت سے اپنے پورے وجود کو دیکھا۔ کیس، داڑھی، کراس، بودھی، گلے کا جنیئو اور ...... ناف کے نیچے یہ — یہ سب کیا ہے؟ — اُس نے سوچا، اتنے عضووں میں، اتنی شکلوں میں کیسے بٹ گیا۔ اُس نے تو ہر مذہب کی تمام کتابوں کو ایک پوٹ میں باندھ کر اندھے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔

پھر سب لاشیں دھیرے دھیرے اُس کی طرف بڑھنے لگیں۔ اُس کے لبوں پر طمانیت سے بھرپور مُسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور اس سے پہلے کہ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے — اس نے اچانک — اپنے کاندھوں پر رکھا ہوا سر اُتار کر ایک لاش کے نیزے کی نوک پر اُچھال دیا — اور پھر دایاں ہاتھ ایک جھٹکے سے الگ کر کے کچھ لاشوں کے آگے پھینک دیا — پھر اپنے پیٹ میں بایاں ہاتھ ڈال کر تمام انتڑیاں اور سب کچھ جو اندر تھا — نکال کر فضا میں بکھیر دیا۔

اب اُس کے جسم کی ہر آنکھ کھُلی ہوئی مسکرا مسکرا ان لاشوں کو دیکھ رہی تھی۔

اور وہ سب لاشیں — کچھ دیر تک اُسے حیرت اور خوف سے دیکھنے کے بعد اُس کے قدموں میں سجدہ ریز ہو چکی تھیں۔

لیکن، جب اُن سب نے سجدے سے سر اٹھائے تو وہاں کوئی نہ تھا۔

فضا میں انگنت رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ سبز، کیسری، سفید اور نارنجی۔

تمام لاشوں کے درمیان ایک لاش خود اس کی اپنی بھی تھی —

لیکن........

اب اس کے جسم کی ہر آنکھ بند ہو چکی تھی۔

* *

پاگل کی ڈائری

جی، ڈی، موپاساں

مناظر عاشق ہرگانوی
ہرگانواں۔ بربگہہ، مونگیر (بہار)

وہ چل بسا ۔۔۔

وہ عدلیہ کا منصف اعلیٰ تھا۔ مثالی اور گوناگوں زندگی کے باعث بڑا ہی مقبول تھا۔ وکلاء، جج اور دوسرے ارکانِ عدلیہ اس کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ پیلا چہرہ، دھنسی ہوئی آنکھیں ۔۔۔ اب تک لوگوں کے ذہن میں محفوظ تھیں۔

اس کی زندگی خیر و شر کی پیمائش میں گذری۔۔ وہ بیاسی سال کی عمر میں مرا۔ لوگوں نے اس کی موت پر عقیدت کے آنسو بہائے۔ نوج رضا کارانہ پوشاک میں ملبوس اسے آخری آرام گاہ تک چھوڑنے گئی ۔۔۔

اس کی موت کے بعد فائلوں کے ساتھ اس کی میز سے ایک ڈائری دستیاب ہوئی جس نے لوگوں کو حیرت اور استعجاب میں ڈال دیا۔

ڈائری اس طرح شروع ہوتی ہے:

۲۰ر جون ۱۸۵۸ء

ابھی ابھی میں عدالت سے آرہا ہوں۔ آج ہی کے مقدمہ کا فیصلہ تھا۔ میں نے اُسے پھانسی کا حکم دے دیا ہے۔ تاہم میں خود اس فیصلے سے مطمئن نہیں ۔۔۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجرم تھا۔ شاید اس کی وجہ میرے ذہن میں بار بار اُبھرنے والا یہ سوال ہو ۔۔۔ "اس نے اپنے بچوں کو کیوں قتل کیا؟" ۔۔۔ میں اس کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔

اکثر ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو قتل و خون میں ایک نامعلوم سی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تخریب بھی تعمیر کی طرح ہے۔ بگاڑنے میں بھی اتنی ہی طاقت کی ضرورت ہے جتنی بنانے میں ۔۔۔ بناؤ اور بگاڑ ۔۔۔ تخریب اور تعمیر ۔۔۔ یہ دنیا کی تاریخ ہے اور انفرادی زندگی کی کہانی۔

۲۵ر جون۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس دنیا میں کچھ ایسی ہستیاں ہیں جو زندہ ہیں۔ گردش کرتی ہیں اور حالات کی "آہ اور واہ" سے دوچار ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا دائرۂ عمل کیا ہے؟ کچھ تو حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ایک ضابطہ کے تحت روبہ عمل ہیں۔ لیکن زمین پر یہ زندگی کا بیج کہاں سے آیا ۔۔۔ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اسے کوئی بھی تباہ کرسکتا ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں رہ سکتا۔ سب کچھ ختم ۔۔۔

۲۶ر جون ۔۔۔

کیوں؟ ۔۔۔ تو کیا یہ ایسا جرم ہے جس کی سزا موت ہو؟ ۔۔۔ حالاں کہ

قانونِ فطرت اس کے برعکس ہے۔

موت برائے زندگی ہونی چاہیئے۔ اور زندگی برائے موت۔ بہترین مثال پرندے، مچھلیاں اور انسان ہیں۔ پرندے اور مچھلیاں اپنی اپنی زندگی کی خاطر ایک دوسرے کی خوراک ہیں ـــــ اور انسان اپنی زندگی کے لیے ان کا شکار کرتا ہے۔

قتل اور خون خوشنودی کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے انسان نے شکار اور دوسرے کھیل ایجاد کئے۔ اسی جذبہ کے تحت بچے کیڑوں کی جان لینے اور تتلیاں پکڑنے میں ایک نامعلوم سی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

ہم لوگوں میں کشت و خون کا ایک حریصانہ جذبہ ہے۔ عہدِ قدیم میں مردم خواری اور انسانی قربانی کی رسم اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں تھیں۔ اب تو ہمارے تحت قوانین اس سلسلہ میں آڑے آتے ہیں۔ انہیں جذبات کے تحت ہمارے بچے اور عورتیں کشت و خون کی کہانیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

ہم مجرم قرار دیتے ہیں اور تختۂ دار تک پہنچاتے ہیں۔ ایک خوفناک قتل ـــــ یا قاتل! پھر ذہنی طور پر ہم جنگ کے بعد جنگ کرتے ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم کے خون کی ہولی کھیلتی ہے ـــ یہی مجرمانہ ذہنیت اور خونی ہوس فوج کو مست و سرشار کرتی ہے۔

فوج ـــــ رضاکارانہ پوشاک میں ملبوس قاتل کو کیا ہم نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ـــــ؟ ـــــ نہیں ـــــ ہم انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تمغۂ اجرت اور خطاب سے نوازتے ہیں ـــ وہ صرف اس لیے کہ ان کا مقصد انسانی خونریزی ہے ـــــ دنیا میں کوئی اچھا اور باعثِ عزت کام ہے تو وہ قتل و خون ریزی ہے۔

۳۰ جون ـــــ

مارنا قانونِ فطرت ہے۔ اس لیے کہ قدرت ازلی چیزوں سے محبت کرتی ہے۔ اس کی ہر حرکت ایک للکار ہے۔ جلد! جلد!! جلد!!! تعمیر کا انحصار تخریب کی زیادتی پر ہے۔

انسانوں کے لیے یہ خوش کن بات ہے کہ وہ بھی اس سلسلے میں قدرت کے پہلو بہ پہلو ہے ـــــ وہ مار سکتا ہے ـــــ وہ مار سکتی ہے۔

خون انسان کے لیے حیرت انگیز دلکشی کا باعث ہونا چاہیئے۔ ہمارے پیشِ نظر ایک مضبوط آدمی کیلئے کوئی قوتِ مردانہ سے بھرپور گٹھا توی ہیکل جسم اور شعلہ زن آنکھیں ہیں ـــــ

۵ اگست ـــــ

میرے ہاتھوں میں انصاف کا میزان ہے۔ ملزم صاد اور قاتل میں قرار دیتا ہوں۔ میں لفظ کے تلفظ سے انہیں کیفر کردار تک پہنچا دیتا ہوں۔ چھرے سے وہ قتل کرسکتا ہے جو چھرا چلانا جانتا ہو۔ اگر میں بھی ان میں سے ایک بن جاؤں تو کسے خبر ـــ؟ کسی کو مجھ پر شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر میں کسی کو بھینٹ چڑھا دوں تو قانون کے لبادہ میں ملبوس ہستی کے متعلق کون سوچ سکتا ہے؟ ـــــ تو کیا مجھے ایسے معاملہ سے دلچسپی ہے؟

۲۲ اگست ـــــ

میں اپنے اس اندرونی جذبے کو کچل نہ سکا۔ دبا نہ سکا ـــ آہستہ آہستہ میرے وجود پر چھا گیا۔ پہلے میرے پیشِ نظر ایک سوالیہ نشان تھا۔ اب میں مجسم سوالیہ نشان ہوں ـــ اور ـــ میں نے قدرت کے ایک حسین شاہکار کو قتل کر دیا۔ ابتدائی اور تجرباتی حیثیت سے ـــــ وہ معصوم اور حسین شاہکار میرے نوکر کی ایک گانے والی سنہری چڑیا تھی۔ اس کی آواز میں نغمگی تھی، سوز تھا، دل آویزی تھی، تڑپ تھی ـــ وہ ایک قفس نصیب پنچھی تھا۔ نوکر کے کمرے کی چھت سے لٹکا رہتا تھا۔ میں نے اُسے باہر نکالا۔ میں صاف طور پر اُس کے دل کی دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ چڑیا گرم تھی۔ میں اُسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اُسے دباتا رہا، پھڑپھڑاتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ میری اس حرکت کے پیچھے وحشیانہ نشاط انگیز جذبہ کارفرما تھا۔ پھر میں نے اس کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ مگر میں جو کچھ دیکھنا چاہتا تھا، نظر نہ آسکا ـــــ خون ـــــ میں نے قینچی سے اس کا گلا کتر دیا۔ اس نے چونچ کھول دی۔ اور میرے ہاتھ میں پھڑپھڑانے لگی ـــــ میں نے اُسے کس کر دبا دیا ـــــ دباتا رہا۔

ـــــ ایک سُرخ فوارہ ـــــ خون'

اس طرح میں نے اپنے مجرمانہ جذبے کی تکمیل کی ـــ ایک خوفناک قتل۔

میں نے اپنی قینچی اور ہاتھ اچھی طرح دھوئے اور اسے باغ میں لاکر سرد بیری کے درخت کے نیچے دفنا دیا ـــــ اب کوئی بھی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ مگر میں اس کے لذیذ پھل کھاؤں گا۔

چڑیا کو نہ پاکر نوکر کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ کافی دیر تک روتا رہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُڑ گئی۔

۲۵ اگست ـــــ

مجھے کسی آدمی کو قتل کرنا چاہیے' ضرور! ضرور!! ضرور!!!

۳۰ اگست ـــــ

میں نے اپنی خواہش کی تکمیل کر دی ـــــ ایک ننھے معصوم انسانی بچے کے ذریعہ ـــــ میں ٹہلتا ہوا آج جنگل کی طرف نکل گیا تھا ـــ کچھ سوچتا ہوا نہیں بلکہ بے خیالی میں۔ اچانک میری نگاہ ایک بچے پر پڑی جو لب سڑک بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے نہایت ہی معصومانہ انداز میں سلام کیا ـــ دفعتاً میرے ذہن میں یہ خیال رینگنے لگا کیوں نہ میں اسے قتل کر دوں۔

"کیا تم تنہا ہو ـــ؟"

"جی۔"

"بالکل تنہا؟"

"جی ہاں۔"

قتل کے خیال نے مجھے شراب کے نشے کی طرح مست و بے خود بنا دیا تھا۔ میں اس کے قریب تر ہو گیا۔ اور اس کے گلے کو پنجہ میں پکڑ کر اُٹھا لیا۔ اس نے ننھے ننھے ہاتھوں سے میری کلائی پکڑ لی ـــــ چھٹ پٹ ـــ چھٹ پٹ ـــــ اس کی لاش بے جان ہو کر جھول گئی۔ میں نے اُسے ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ پھر گھر واپس آکر خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ دل کا بوجھ ہٹا ہوا محسوس کیا۔ شام دوستوں کے درمیان نہایت پُر لطف انداز سے گذاری۔ اُس دن میرے دوستوں نے خاص طور پر کہا کہ اس سے قبل وہ لوگ میری صحبت سے اس قدر مستفید نہیں ہوئے تھے۔

مجھے ایک خاص چیز نے اتنا پر لطف بنا دیا ہے!

۳۱ اگست ـــــ

چند شکاریوں نے اس کا سراغ لگا لیا۔

۱ ستمبر ـــــ

اس سلسلہ میں دو مسافروں کی گرفتاری عمل میں آئی۔

۲ ستمبر ـــــ

اس کے والدین میرے پاس آئے تھے اور بہت رو رہے تھے۔

۶ اکتوبر ـــــ

اس سلسلہ میں مزید کچھ پتہ نہ چل سکا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی خانہ بدوش نے مارا ہوگا۔

۱۰ اکتوبر ـــــ

ایک روز ـــــ میں صبح ناشتہ کرکے ٹہلتا ہوا دریا کے کنارے نکل گیا۔ وہاں بید کی جھاڑیوں کے قریب ایک ماہی گیر سو رہا تھا۔ یہ قریب دوپہر کا وقت تھا۔ پاس ہی آلو کے کھیت میں پڑا ہوا کدال میرے خفتہ جذبے کو اُبھارنے کے لیے کافی تھا ـــ میں بڑھا ـــ کدال اُٹھائی ـــ اور واپس آیا ـــ ماہی گیر انجام سے بے خبر تک سو رہا تھا۔ میں نے سرعت کے ساتھ کدال اوپر کی طرف اُٹھائی ـــــ نشانہ لگایا ـــ بھرپور طاقت سے اُس کی گردن پہ مارا ـــ جھٹکا ـــ قتل ـــــ ایک خفیہ قتل۔ صحیح معنوں میں میں نے آج ایک آدمی کا خون کیا ـــــ خون ـــ گلاب کے پھول کی طرح سُرخ خون اُبل اُبل کر دریا کی طرف جا رہا تھا۔ پانی اور خون ـــــ خون اور پانی ـــــ جیسے ایک دوسرے کے جزو تھے جو دھارے کی ہر آمد کے ساتھ مدغم ہو رہے تھے۔ میں اپنے اس سنگین اقدام کے بعد واپس چلا آیا۔ میں نے سوچا کہ میں نے اپنے پیشے کے لحاظ سے ایک جرم کیا ہے۔ نہایت ہی خوفناک جرم ـــ

۲۵ اکتوبر ـــــ

مانجھی کے واقعہ نے مجھے حد درجہ خوفزدہ کر دیا تھا لیکن اس کے بھتیجے کو قاتل قرار دیا گیا اسلئے کہ مانجھی سے ملنے والا وہی آخری شخص تھا۔

۲۶ ، اکتوبر ـــــ

EXAMINING MAGISTRATE نے بھی اُس کے بھتیجے کو ہی مجرم قرار دیا۔ حالانکہ اُس نے اپنے تئیں بہت کچھ صفائی پیش کی مگر اُس کی آواز سننے والا کون تھا۔

۲۸ ، اکتوبر ـــــ

الزام کے خلاف اس کے پاس بہت کچھ تھا تاہم اُس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ کون جانے اس کے پیچھے دہشت تھی یا لالچ۔

فیصلہ کسی قدر مضحکہ خیز تھا مگر انصاف' انصاف ہے۔

۱۷ ، نومبر ـــــ

اُس کے خلاف بہت سی شہادتیں پیش کی گئیں اور یہ بتایا گیا کہ چچا کا وہی وارث تھا۔ اُس اجلاس کی صدارت میں نے کی۔

۲۵ ، جنوری ـــــ

موت ! موت !! موت !!! ـــــ میں نے اُسے پھانسی کا حکم دیدیا۔ اس دن میں اس کا خون دیکھنے جاؤں گا۔

۱۰ ، مارچ ـــــ

ختم ہو گیا ـــــ آج اسے تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ بہت مزے میں مرا۔ صحیح معنوں میں اس کی موت بہت مزے میں ہوئی۔ آج کے منظر نے ایک دفعہ پھر مجھے فرحت و انبساط سے دوچار کیا۔ میرے اشارہ پر ایک شخص کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔

ـــــ در اصل یہ دوسرا قتل تھا ـــــ ایک کا اور اضافہ ہو گیا۔

اب میں انتظار کروں گا۔

ڈائری مزید کئی صفحوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد دوسرے جرم کے متعلق کچھ نہ مل سکا۔

جب بیرونی حکمار کو یہ حیرت انگیز کہانی سنائی گئی تو ان لوگوں نے متفقہ طور پر کہا کہ دنیا میں اس قسم کے بہت سے پاگل موجود ہیں جو کہ عوامی زندگی میں چالاک اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ ٹھیک اس وحشی منصف کی طرح۔ لیکن ان کا ذاتی کردار بڑا ہی مکروہ اور خوفناک ہوتا ہے۔ ان کے خیالات میں پختگی اور وزن ہوتا ہے۔ اس کے اسباب غلط فکری نقطہ ہائے آغاز ہوتے ہیں ـــــ

* *

عارفؔ عبدالمتین (پاکستان)

میں آفتاب ہوں ظلمت سے دل لبھاؤں کیا
تو میرا سایہ سہی تجھ سے جاں چھڑاؤں کیا

زمانہ دیکھتا ہے اپنے خال و خد مجھ میں
میں آئینہ ہوں تو خود کو نہ دیکھ پاؤں کیا

تری وفا کو پرکھنے سے پہلے تو ہی بتا
ترے حوالے سے خود کو نہ آزماؤں کیا

میں اپنی آگ میں جل بجھ چکا ہوں مدت سے
مثالِ شمع میں محفل میں جگمگاؤں کیا

اگر نہیں ہے منانا تجھے مرے بس میں
میں اپنے آپ سے پل بھر کو روٹھ جاؤں کیا

مرے وجود کو محسوس کر تِسکار نہ کر
میں ایک موجۂ نکہت ہوں ہاتھ آؤں کیا

مثالِ موج ترے وصل کی تمنا ہے
بھنور کی طرح سرِ بحر گھوم جاؤں کیا

تو میرے درد سے ناآشنا ہے کیوں عارفؔ
میں اس کو چہرے کی محراب پہ سجاؤں کیا

آزاد گلاٹی

گورنمنٹ کالج - نابھہ (پنجاب)

سلگتی ریت میں رُت کا پتا کوئی نہیں دیتا
ہو جیب بے کیف تو لطفِ صدا کوئی نہیں دیتا

جو خود بھوگی ہوئی ہو وہ سزا کوئی نہیں دیتا
کسی کے ہاتھ میں اب آئینہ کوئی نہیں دیتا

بکھرتے ٹوٹتے رشتوں پہ سب آنسو بہاتے ہیں
عذابِ ربط ہو تو آسرا کوئی نہیں دیتا۔

بدن کی آگ کیوں احساس کو جھلسانے لگتی ہے
اسے خواہش کی جب مدھم ہوا کوئی نہیں دیتا

جو ہم پیچھے رہیں تو راہ سب ہموار لگتی ہے
مگر آگے بڑھیں تو راستہ کوئی نہیں دیتا

کہاں سے ڈور تنہائی کی سلجھائیں کہ ہر کوئی
گرہ پر ہاتھ رکھتا ہے سِرا کوئی نہیں دیتا

وہ غم ہو یا خوشی ہو، زندگی یا موت ہو آزادؔ
خود اپنے خون کا سا ذائقہ کوئی نہیں دیتا

صلاح الدین نیّرؔ

۲۰ - ۶ - ۳۴۴ — بازارِ ادب لال - حیدرآباد ۲

یہ کیسی بزم ہے ہر اک نگاہ پیاسی ہے
یہاں بھی اپنے ہی گھر کی طرح اُداسی ہے

بڑے خلوص سے ہم آ گئے تھے مے خانہ
مگر یہاں بھی وہی مصلحت شناسی ہے

نظر ملا کے کہاں تم نے ساتھ چھوڑ دیا
وہ بے قرار نگہہ آج تک بھی پیاسی ہے

جہاں کہیں بھی اُصولوں کا قتل ہوتا رہا
وہاں پہ پھیلی ہوئی اب بھی بدحواسی ہے

رفیقِ دل کی طرح کون ساتھ دیتا ہے
لبوں پہ سب کے تو اظہارِ غم شناسی ہے

نگاہِ دوست میں کچھ فرق آ گیا شاید
فضائے دیر و حرم پھر خفا خفا سی ہے

جنوں پسند رفیقوں کو کیا ہوا نیّرؔ
زمینِ کوچۂ دلدار کب سے پیاسی ہے

وہاب دانشؔ

لوور بازار — رانچی (بہار)

ہر ایک داغ خلا دائرے کا نقطہ جی
حصار توڑ کے بڑھنا ہمارا حصّہ جی

زمین زرد، فضا لازوال در دہی درد
ہے اپنے سامنے صدیوں سے ایک نقشہ جی

رہِ فرار کی لذّت میں ہر صدا تنہا
ہجومِ صوت میں ہر چیخ ایک شوشہ جی

کوئی سفید کسی کے سیاہ میں مصروف
تمام شہر یہی آدمی کا قصّہ جی

میں ایک بندۂ صد نام حرف حرف شریک
نہ میرے حق میں ہے سجدہ نہ کوئی بوسہ جی

کوئی ہے صبح، سحر، روشنی کا نام پرست
کسی کے پاس سیاہی کا صرف نوحہ جی

کسی کے رنگ، نہ خوشبو نہ بات کا جادو
ہے اپنے پاس مگر گفتگو کا لہجہ جی

خدا کے ساتھ کہیں وہ بھی کھو گیا ہوتا
نہ مل سکا کبھی دانشؔ کو ایسا گوشہ جی

دائرہِ جسم مقیّد سی مری جان صفر
آگہی موم کا نقطہ اَنا ایقان صفر

سر ہر اک شور سے اُلجھا ہوا خوشۂ غم کا
مسئلے شاخ اُٹھائے ہوئے عرفان صفر

نقد کی نوک سے آئینے چرائے آنکھیں
نرغۂ سنگ میں ہر عکس کی پہچان صفر

رشتۂ لب سے تھے الفاظ سنہرے سپنے
خواب تحریر میں آئے تو تھے انجان صفر

ایک نقطہ ہے بہرکیف! مگر داغ تو ہے
تو خدا ہے تو ترے سر پہ یہی شان صفر

ٹوٹ کے پھیل گیا دائرہ بنتا ہی گیا
جس کے سینے میں تھا دانشؔ وہی آسان صفر

اظہار آثر

وائے ۵۔ ڈی۔ ڈی۔ اے کالونی۔ نیو رنجیت نگر۔ نئی دہلی

دِل کے زخموں کو مہک، درد کو لذّت دی ہے
میرے خوابوں نے ہر اِک شے کو حقیقت دی ہے

ورنہ محدود دِشاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
آسماں کو مری نظروں نے یہ وسعت دی ہے

عمر بھر زہر پیا تیرے لبوں کو چھو کر
ہم نے چھوٹی سی خوشی کی بڑی قیمت دی ہے

پھر مہکتی ہوئی آئی ہیں وہ پہلی کرنیں
چاندنی نے ترے آنے کی بشارت دی ہے

زِندگی شہرِ حوادث ہے تو کیا غم ہے اثرؔ
دِن نکلنے کی ہر اک شب نے شہادت دی ہے

عقیل شاداب

برج راج پورہ۔ کوٹہ (راجستھان)

گذر رہی ہے دِل وجاں پہ واردات ایسی
کہ زندگی ہوئی کاغذ قلم دوات ایسی

ہر ایک لمحہ سروں پر ہے سانحہ ایسا
ہر ایک سانس گذرتی ہے حادثات ایسی

نفس نفس سے نِدائے نیاز آئے ہے
کرے ہے دِل پہ اثر اس کی بات بات ایسی

وہ دِن جو تھا ترے مہتاب سے بدن ایسا
وہ رات جو تھی ترے گیسوؤں کی رات ایسی

قریب آئے تو اپنا ہی سامنا تھا ہمیں
ہمارے بیچ میں حائل ہوئی تھی ذات ایسی

ہے کوئی عکس مرے ذہن میں خدا ایسا
ہے کوئی شے مرے سینہ میں کائنات ایسی

ترے بغیر گذاری ہے جس طرح ہم نے
خدا نہ دے کسی دشمن کو بھی حیات ایسی

خود اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے دیوانے
تھی قیدِ زلف بھی گویا شبِ نجات ایسی

حیات و موت کا ہر فرق مِٹ گیا شادابؔ
بساطِ زیست پہ کھائی ہے میں نے مات ایسی

کرشن کمار طورؔ

ہماچل پردیش ٹورزم ۔ ڈیولپمنٹ کارپوریشن ۔ رٹز ایونیو ۔ شملہ

سفاکیٔ سلوکِ جہاں در جہاں کھلی
ہم پر بھی اب حقیقتِ حسنِ گماں کھلی

دیکھوں کہ ہے وجودِ افق پر گرفتِ چشم
سوچوں کہ اب مسافتِ دشتِ تپاں کھلی

رکھیں تمام خواہشیں سیدِ طلسمِ دہر
کچھ یوں بھی خوش مزاجیٔ عمرِ رواں کھلی

چاروں طرف سے سنگِ ملامت برس پڑے
آواز دی تو سیرتِ شیشہ گراں کھلی

ننگی ہوئی جو بیٹھ تو لکھی کتابِ درد
چسپاں ہوئی تو جنبشِ دستِ گماں کھلی

دیوار و در سے جیسے کہ کوندے لپک پڑے
سیلِ وجود اٹھا تو حدِ مکاں کھلی

تھا طورؔ اپنا چہرہ ہی آئینۂ حیات
افتاد کیا پڑی کہ جو اپنی زباں کھلی

شکیل مظہری

دی دانڈیلی فَرو الوویز ۔ دانڈیلی ۵۸۱۳۲۵

بکھرتی خاک تھے ہم، تیری رہگذر کے تھے
ہمارے ساتھ بھی حادثے سفر کے تھے

یہ اور بات کہ تعبیر جل گئی اپنی
ہمارے خواب تو رنگینیٔ سحر کے تھے

ہمارے مسئلے خود ساختہ تھے دنیا میں
نہ دشمنوں کے نہ یارانِ معتبر کے تھے

حیات بانٹتی پھرتی تھی جو زمانے کو
ہمارے دِل پہ کئی زخم اس نظر کے تھے

نفس کی آمد و شد میں تمازتیں تھیں نہاں
یہاں تو جو بھی تھے سب خیمۂ شرر کے تھے

سنبھالتے رہے یادوں کی جلتی شمعوں کو
کہ ہم تو دہر میں قابل اسی ہنر کے تھے

بکھرتے ٹوٹتے پھرتے تھے کو بکو یارو
کسے بتائیں کہ ہم سوکھتے شجر کے تھے

سحر ہوئی تو ہمیں چن لیا اُجالوں نے
شکیلؔ ہم یہاں مہمان رات بھر کے تھے

رئیس مالیگانوی

بزمِ جمال ۔ مومن پورہ ۔ مالیگاؤں (ناسک)

وہ ناشناس ادب ہے تو زخم گہرا دو
جو ہو سکے تو زباں پر بھی قفل لگوا دو
تفکرات کے زینوں کو آؤ چنوا دو
جنوں میں جامۂ الفاظ خود ہی نچوا دو
ہوس کی آگ بجھانا ہی جبکہ لازم ہے
صعوبتوں کے بگولوں میں سب کو بکھرا دو
بہل سکے جو طبیعت حضورِ والا کی
شکستہ ہاتھوں میں زنجیرِ جبر پہنا دو
عقیقتوں کا نہ جس علم و فن سے پاؤ سراغ
اندھیرے غار میں اس علم و فن کو دفنا دو
تمہارے علم و فراست کی انتہا معلوم!
لہو سے میں نے لکھی ہے کتاب لوٹا دو
بصد تلاش رئیسؔ ایک ہمزباں سے ملا
جوازِ تلخیٔ الفاظ اب ترشوا دو

خشک آنکھوں میں جھلکتا ہوا پانی رکھتا
وہ جو مجھ سے کوئی پہچان پرانی رکھتا
ہر نیا لمحہ جنم دیتا ہے افسانوں کو
کب تلک سینے میں صدیوں کی کہانی رکھتا
حرف بن جاتا سلگتا ہوا پیماں کوئی
اپنے شعروں میں اگر سوزِ نہانی رکھتا
ہر سڑک لوٹ کے بنیاد تلک جاتی ہے
دور لفظوں سے میں کس طرح معانی رکھتا
چند لمحوں کا اگر ساتھ صدی دے جاتی
وقت کے سامنے شعلوں کی کہانی رکھتا
اس زمیں سے بھی مرا بوجھ سنبھالا نہ گیا
آسماں بوڑھا تھا کیا مجھ کو نشانی رکھتا
ہر بتِ سنگ میں اک کوہِ ندا پایا جاتا
شہرِ آذر ہی جو پتھر کی زبانی رکھتا
شیشہ در شیشہ وہی عکس جھلکتا ہے رئیسؔ
کاش! وہ ذات کا احساس بھی فانی رکھتا

راشد مفتی

عزیز آباد ۔ کراچی (پاکستان)

جس وقت یہ جھلسی ہوئی ڈالی ہری ہوگی
کیا کیا نہ خزاں ہاتھ لگاتے ڈری ہوگی
پتّوں کو سلیقہ تھا کہاں سینہ زنی کا
سسکی کہیں شاخوں میں ہوا نے بھری ہوگی
پانی کا کبھی قحط لہو کا تو نہیں ہے
اے خاک ۔۔ کہیں سے تو میسّر تری ہوگی
ٹھہرائے گا اوروں کو وہی موردِ الزام
تہمت کبھی اپنے پہ نہ جس نے دھری ہوگی
انسان خود انسان سے کم خوف زدہ ہے
کب خلقِ خدا، قہرِ خدا سے ڈری ہوگی
دُنیا سے الگ تم نے بسائی ہے جو دُنیا
وہ بھی تو اسی شور و شغب سے بھری ہوگی
غربت میں مگن میری طرح کون رہے گا
راس اور کِسے میری طرح بے زری ہوگی

انجم ترازی

۳۱۶ ۔ ڈی سیٹلائٹ ٹاؤن ۔ سرگودھا (پاکستان)

تڑپ رہے تھے سبھی لوگ کھیل ایسا تھا
کہ زندگی کا ہر اک لمحہ جیل ایسا تھا

زمین آگ تھی اور آسماں دھوئیں کیطرح
سمندروں میں جو پانی تھا تیل ایسا تھا

ملی کسی کو تمازت نہ میرے سورج سے
کہ میری دھوپ سے چھاؤں کا میل ایسا تھا

مرے خلاف ہر اک شاخ متحد نکلی
کہ میں ہی پیڑ پہ آکاش بیل ایسا تھا

مرے وجود سے لپٹا ہوا تھا شہر تمام
ہر اک بدن پہ لبادہ چڑیل ایسا تھا

فصیح اکمل قادری

۹۵۴، گلی چاہِ شیریں۔ فراش خانہ۔ دہلی ۶

یوں سادگی سے دِل کو نہ اپنے اُداس رکھ
دنیا ہے بد خصال تو پتھر بھی پاس رکھ

کرتے ہیں لوگ وار بھی کتنے خلوص سے
اب ساتھ اپنے کوئی قیافہ شناس رکھ

الفاظ جیسے سر بگریباں ہوں اِن دِنوں
ہر پیکرِ خیال ابھی بے لباس رکھ

اِنسانیت کے شعلۂ آخر کا رقص ہے
اِنسان کو کچھ اور ابھی بدحواس رکھ

مانگے کے ٹائی کوٹ سے بنتی نہیں ہے بات
پہرا اگر ہے تیرا تو اپنا لباس رکھ

اختر بستوی

روشن محل۔ گاندھی نگر۔ بستی (یو۔پی)

مجرمانِ فن ہمیشہ یہ سزا پاتے رہے
"تاج" کی تخلیق کر کے ہاتھ کٹواتے رہے
شرطِ ناکردہ گناہی یاد تھی کس کو بھلا؟
لوگ بے دردی سے پتھر مجھ پہ برساتے رہے
آگیا شعلہ گروں کی صف میں اُن کا ذکر بھی
برف پر چنگاریاں رکھ کر جو دہکاتے رہے
کنکروں کا بھاؤ سُن کر عہدِ نو کے جوہری
موتیوں سے جھولیاں بھر بھر کے پھیلاتے رہے
جانے کس جانب یقیں کی شوخ پریاں اُڑ گئیں
وسوسوں کے بھوت ہر ہر سمت منڈلاتے رہے
رہروانِ دشتِ خوفِ مرگ کو، کچھ سر پھرے
زندگی کے شہر تک مر مر کے پہنچاتے رہے
فوج اِک، اختر تمہارے ذہن میں خوابوں کی تھی
عمر بھر تم جس کی پسپائی سے گھبراتے رہے

شبیر آصف

مشرقی محمد علی روڈ - نیا پورہ ، مالیگاؤں (ناسک)

دل وہ بے مہر کہ اپنی کبھی سنتا ہی نہیں
خود فریبی کے سوا جیسے گذارا ہی نہیں

راستے دے نہ سکے مجھ کو فریبِ منزل
میں کسی موڑ پہ دم لینے کو ٹھہرا ہی نہیں

تجھ کو ویرانیٔ دل کا مری احساس کہاں
تو کسی اُجڑے ہوئے شہر سے گذرا ہی نہیں

جانتے ہیں کہ تہہِ آب ملیں گے موتی
کوئی دریا میں مگر ڈوبنے والا ہی نہیں

تو ابھی زیست کے مفہوم سے ناواقف ہے
آسماں سے تو زمیں پر کبھی اُترا ہی نہیں

دیکھ اے دوست ، اسے کہتے ہیں معیارِ وفا
چاکِ دل سی تو لیا زخم کو چھیڑا ہی نہیں

ہنستے چہرے کے نہاں خانے میں کیا کیا غم ہیں
تو نے آنکھوں میں مری جھانک کے دیکھا ہی نہیں

باڑھ اندھیروں کی کوئی پھاند گیا تھا پھر بھی
اُس کی قسمت کا ستارہ کبھی چمکا ہی نہیں

اجنبی سا وہ مرے پاس سے گذرا آصف
ایسا لگتا ہے کہ اُس نے مجھے دیکھا ہی نہیں

شبیر مجاہد

معرفت ڈاکٹر فاروقی - چونا بھٹی - مالیگاؤں (ناسک)

میں اپنے خون سے گلشن میں رنگ بھر جاؤں
بہار آئے نہ آئے ، یہ کام کر جاؤں

اِسی خیال سے اب تک تجھے نہیں ڈھونڈا
کہ تو مِلے تو خوشی سے کہیں نہ مر جاؤں

نگاہِ ناز تری اُٹھ کے راستہ روکے
میں اِک قدم بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

یہ التجا ہے صبا سے کِسی کے گیسو کی
تو تھوڑی دیر جو ٹھہرے تو میں سنور جاؤں

کبھی کبھی تو یہ جی چاہتا ہے کیوں اے دوست
کچھ اس طرح سے میں ٹوٹوں بکھر بکھر جاؤں

احمد حسین شمس

کشن گنج۔ پورنیہ' (بہار)

وہی عندلیبِ شکستہ پر جو ابھی قفس سے رہا ہوا
لیے دل میں سیکڑوں حسرتیں تہہِ شاخِ گل ہے پڑا ہوا

اگر اپنے قلب کا حوصلہ دمِ جستجو نہ فنا ہوا
تو وہ دشت گم شدہ ذات کا کفِ پا ہی سے ہے ملا ہوا

وہ تمہاری گردشِ چشم تھی کہ پیالے ہی میں خود آگ تھی
ابھی ہاتھ اٹھا بھی نہیں مرا کہ وجود جل کے ہوا ہوا

تری بخششیں مرے ظرف کو ہمہ وقت بھاتی رہی ہیں کیوں
دل اگرچہ کوزۂ گِل ہی مگر آگ میں ہے تپا ہوا

وہ خرد کہ جس پہ فریفتہ یہ مکاں بھی ہے یہ زماں بھی ہے
جو سمجھ سکیں تو خودی ہوئی نہ سمجھ سکیں تو خدا ہوا

مجھے کیوں ہو فکرِ شکستگی کہ بگڑ بگڑ کے بناؤں میں
اِک ازل ہی سے مرے ظرف کا یہی سلسلہ ہے لگا ہوا

منوہر لال ہادی

۱۳۷/ سیکٹر III آر۔ کے پورم۔ نئی دہلی ۲۲

کوئی دریا کبھی بہتا نہیں پانی کے بغیر
جینا پڑتا ہے مگر ہم کو جوانی کے بغیر

پتّی پتّی پہ لگی ہے ترے دربار کی مہُر
ایک بھی پھول نہیں تیری نشانی کے بغیر

قصرِ پستی سے نکل آئے گا دل آپ ہی آپ
لب ہلاؤ تو سہی حربِ زبانی کے بغیر

کتنے افسانے سُنے، کتنے مناظر دیکھے
یاد کچھ بھی نہ رہا اپنی کہانی کے بغیر

فاصلے خود ہی سمٹ جائیں گے بے شور و شغب
جی کے دیکھو تو سہی قیدِ مکانی کے بغیر

جانے کیا بات ہے کیوں زندگیٔ لافانی
رہ نہیں سکتی کہیں عالمِ فانی کے بغیر

آرزوؤں کے دیئے، جہد و تجسّس کے چراغ
لَو نہیں دیتے کبھی سوزِ نہانی کے بغیر

سوچنے بولنے کا ساز دو ان کو ہادی
بے لب و ذہن ہیں الفاظ معانی کے بغیر

محبوب شیدائی

ٹریڈنگ سینٹر۔ ٹیپو سلطان روڈ۔ ڈھاکہ (بنگلہ دیش)

شب کی پرہول خموشی میں گجر لے کے چلو
سوئے منزل جو چلو عزمِ سفر لے کے چلو
دِل میں احساس فروزاں ہے اگر لے کے چلو
انقلاباتِ جنوں خیز سحر لے کے چلو
بزمِ آشفتہ سراں سے نہ تہی دست اُٹھو
صاحبِ دِل کی طرح کچھ تو اثر لے کے چلو
توڑنا ہے جو تمہیں سطوت و ثروت کا غرور
دستِ کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو
تیرہ و تار زمانے کے گھنے جنگل میں
سر پہ جلتا ہوا سورج کا نگر لے کے چلو
کوئی پُرساں ہی نہیں صدیوں سے بیماروں کا
دوستو، تم نفسِ عیسیٰ اثر لے کے چلو

حصیر نوری

کوارٹر نمبر F / 3/8 جوائنٹ کوارٹر، محمد پور، ڈھاکہ (بنگلہ دیش)

چمن میں فصلِ خزاں سے نہ کاروبار کرو
نئی حیات کے موسم کو خوشگوار کرو
کِسی کے حُسنِ سماعت پہ کیوں گراں گذرے
جو رازِ دِل ہے وہ مجھ پر ہی آشکار کرو
نِگل ہی لے گی اندھیروں کو روشنی لیکن
نئی سحر ابھی آتی ہے انتظار کرو
ہر ایک سمت ہے سعیٔ عمل کا سکّہ رواں
تم اپنے شہر کے لوگوں پہ اعتبار کرو
مزہ تو جب ہے کہ ہر شخص تم سے پیار کرے
عمل کی راہ کوئی ایسی اختیار کرو
لبوں کو حرفِ شکایت سے واسطہ نہ رہے
کِسی سے پیار کیا ہے، تو ایسے پیار کرو
اُداس نسل کی راہوں میں بن کے تم سورج
زمیں پہ اپنی محبّت کو شعلہ بار کرو
یہ سیرِ گردشِ امواج، تا کجے یارو!
پھنسا ہوا ہے سفینہ بھنور میں، پار کرو
حصیرؔ تم سے عنایت کا میں نہیں طالب
کِسی پہ چاہے عنایات، بے شمار کرو

حسن عزیز

۹۷/۵۹ طلاق محل ــ کانپور

بے خبر کر کے مجھے اب حدِ امکاں میں آ
گردشِ خاک سے بچ پیکرِ آساں میں آ

تیغِ امواج اٹھائے ہوئے اے بحرِ وجود
ریگِ صحرا کی طرح تو بھی ذرا آن میں آ

مارے جائیں گے نہ تنہائی کے ہاتھوں ہم لوگ
مجھ کو تو جان لے اور تو مری پہچان میں آ

وہ بھی پچھتایا بہت گھوم کے شہروں شہروں
میں ہی شرمندہ نہیں دشت و بیاباں میں آ

سایۂ خوں نے مجھے خاک کیا تھا جس رنگ
جل گیا وہ بھی حسن جسم کے شمشان میں آ

ماہر منصور

دنوبانگر ــ ٹمکور ۵۷۲۱۰۱

وہ ایک چہرہ جو با گل بنا گیا مجھ کو
سُنا ہے شہر میں دیتا تھا پھر صدا مجھ کو

اسیرِ شہر ہوں میں کس طرح وہاں جاؤں
بُلا رہا ہے پہاڑوں کا سلسلہ مجھ کو

اُجالے بانٹتا پھرتا تھا جو اندھیروں میں
وہ روشنی کو ترستا ہوا مِلا مجھ کو

میں ٹوٹا ٹوٹ کے راہوں پہ گرتا جاتا ہوں
کہاں تلک کوئی رہبر گھسیٹتا مجھ کو

بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے دنیا کو
خدا کے واسطے پھر سے نہ یوں بلا مجھ کو

وہی ہوں ماہرِ خستہ مگر سبب کیا ہے
جو آج دیر سے تکتا ہے آئینہ مجھ کو

سیّد ارشاد حیدر

۶۰۵ . دریا باد - الہ آباد

نواحِ آسماں مِرا سفر ہے اب
کہ گھورتا خلا بسِ نظر ہے اب

چلو نجات کی کوئی چمک ملی
گِرا تھا آنکھ سے جو، وہ گہر ہے اب

ورق ورق وہ ڈھونڈتا ہے جانے کیا
میں مر چکا ہوں اور یہ خبر ہے اب

کچھ اس طرح سے شب کے بال و پر جلے
کہ آنکھ میں بجھی ہوئی سحر ہے اب

ہمک رہی ہے نیزہ نیزہ بے بسی
کہ زیرِ آسماں اِک اور سر ہے اب

معصوم نظر

لال پورہ - ڈونگرپور ۳۱۴۰۰۱ (راجستھان)

صرف میری ذات کا عنوان لے
پھر لہو کے لفظ کو پہچان لے

بھول جائے گا سبھی نام و نشاں
ہو رہی ہے دھند گہری جان لے

یاد آتی ہے مجھے اِک ایک بات
رفتہ رفتہ درد کا میزان لے

دور تک منزل نہ کوئی رہ گزر
زندگی صحرا ہوں تو پہچان لے

توڑ دے زنجیر میرے جسم کی
ڈال دے چٹان میری جان لے

یہ تیری آواز بھی کھو جائے گی
بے خبر رہ جائے گا تو مان لے

اے سمندر آج کیوں خاموش ہے
وقت کی آواز کو پہچان لے

اُس کا کمرہ

رشید عارف
ڈاکٹر ڈھولے بلڈنگ ۔ ماچس فیکٹری لین ۔ کرلا ۔ بمبئی ۷۰

عمارت کی کئی سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ برآمدے میں اپنے کمرے کے سامنے آکر کھڑا ہوا تو اس کی سانس دمے کے عارضے میں مبتلا کسی بڈھے کی سانس کی طرح چل رہی تھی ۔ وہ جوان تھا مگر اُسے جوان نہیں کہا جا سکتا تھا کیوں کہ آج کل جوانی آتی ہی کب ہے ؟ بچپن اور بڑھاپا ! یہی دو مدارج آدمی کی زندگی میں رہ گئے ہیں ! اپنی اُکھڑی ہوئی سانس کے قابو میں آنے تک وہ کھڑا ہانپتا رہا ۔ جب اُس کی سانس پوری طرح قابو میں آگئی تو اُس نے پتلون کی جیبیں ٹٹولیں ۔ داہنی جیب سے کنجی نکال کر اس نے کمرے کا تالا کھولا اور دروازوں کے پٹ اندر کی طرف ڈھکیل کر کمرے میں داخل ہوگیا ۔

کمرے میں گھٹن سی تھی اور اندھیرا بھی تھا ۔ کمرے میں کوئی بھی چیز اُسے صاف طور سے دکھائی نہیں دی ۔ اس کی آنکھوں کی بینائی بھی کچھ کم ہوگئی تھی ۔ اُس نے بائیں طرف مڑکر دروازے کے پیچھے بجلی کا بٹن ٹٹولا ۔ ایک دوبار ٹٹولنے کے بعد بٹن اُس کی انگلیوں کی گرفت میں آگیا ۔ اُس نے بٹن دبا دیا ۔ "چٹ" کی خفیف سی آواز ہوئی مگر کمرہ بدستور اندھیرے میں ڈوبا رہا ۔ وہ آنکھیں پھاڑے چھت میں لٹکے بلب کی طرف گھورنے لگا ۔ اُسے یہ سمجھنے میں قطعی دیر نہیں لگی کہ بجلی غائب ہے ۔

اب اُس نے سوچا ، پنکھے کا بٹن تلاش کرنے سے کیا فائدہ ؟ اُسے کھڑکی کھولنی چاہیئے ! شاید کھڑکی کھولنے سے اندھیرا اور گھٹن کچھ کم ہو جائے ! یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا ۔ چیزوں کے ٹکرانے کے ڈر سے محتاط قدم اُٹھاتا ہوا وہ کھڑکی تک پہنچ گیا اور کڑی ٹٹول کر اُس نے کھڑکی کھول دی ۔ کھڑکی کھُل تو گئی لیکن اندھیرا جوں کا توں برقرار رہا اُس میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا اور نہ کمرے میں گھٹن ہی کم ہوئی ۔ اُس کی کھڑکی کے سامنے باہر کسی دوسری عمارت کی دیوار کھڑی تھی !

کمرے میں ایک اور کھڑکی تھی ۔ وہ جھنجھلا کر اس کی طرف مڑا ۔ جوں ہی وہ آگے بڑھا اُس کا گھٹنا کرسی کے ہتھے سے ٹکرا گیا ۔ وہ تلملا اُٹھا ۔ اُس کے گھٹنے میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ۔ گھٹنے کو ہاتھ سے دباتا ہوا وہ کھڑکی تک پہنچا ۔ اُس نے پھر کڑی ٹٹول کر کھڑکی کے پٹ باہر کی طرف ڈھکیل دیئے ۔ یہ کھڑکی بھی کھل گئی لیکن نہ تو کمرہ روشن ہوا اور نہ ہوا کا جھونکا ہی آیا ۔ اُس کے کمرے کی یہ کھڑکی روشنی اور ہوا کے رخ کی طرف تھی ہی نہیں !!

اُس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی کیوں کہ گھٹنے میں درد ابھی باقی تھا ۔ اُس نے

ایک بار گھنا دبا کر کچھ بڑبڑانا چاہا لیکن اُس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اس کا حلق سوکھا ہوا تھا۔ بڑی دیر سے اُسے پیاس لگی تھی اس نے سوچا تھا کہ کمرے میں پہنچ کر کھڑکیاں کھولنے کے بعد ہی وہ اطمینان سے پانی پئے گا۔ سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیرتا ہوا وہ اب موری کی منڈیر کی طرف بڑھا۔ منڈیر پہ مٹکا رکھا ہوا تھا۔ وہ سویرے ہی اُسے بھر کر گیا تھا۔ منڈیر کے پاس پہنچ کر اُس نے مٹکے سے ڈھکن ہٹایا اور گلاس اُٹھا کر اندر ڈبو دیا۔ گلاس سیدھا مٹکے کی سطح سے جا ٹکرایا۔ مٹکا خالی تھا شاید سارا پانی چو گیا تھا!

اُس نے سوچا چھوڑو مٹکے کو! نل ہی سے گلاس بھر کر پانی پی لیتا ہوں! یہ سوچ کر وہ نل کے قریب آیا۔ اُس نے جلدی جلدی نل کے پیچ گھما کر گلاس نل سے لگا دیا۔ نل کے سارے پیچ کھل جانے کے بعد بھی پانی کی ایک بوند تک نہیں ٹپکی!! وہ نل سے گلاس لگائے دیر تک کھڑا رہا۔ اُسے لگا جیسے وہ صحرا میں گھوم رہا ہے جہاں حدِ نظر تک سراب ہی سراب ہے! مایوس ہو کر اُس نے گلاس منڈیر پہ رکھ دیا۔

بھوک سے اُس کی آنتیں بھی اینٹھ رہی تھیں۔ اُس نے سوچا کچھ کھا ہی لیتا ہوں! یہ سوچتا ہوا وہ چولہے کے قریب آ گیا۔ اُس نے بیٹھ کر دیگچی ٹٹولی۔ وہ سویرے ہی کھچڑی زیادہ پکا کر گیا تھا۔ دوپہر کے لیے کچھ وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور کچھ اس نے شام کے لیے رکھ چھوڑی تھی کہ تھک کر آنے کے بعد اُسے کھچڑی دوبارہ نہ پکانی پڑے۔ جوں ہی اُس نے دیگچی پہ کی رکابی ہٹائی ایک تیز بدبو کا بھبکا اُس کے نتھنوں سے ٹکرایا اُس نے بُرا سا منہ بنا کر ناک سکوڑ لی۔ کھچڑی گرمی کی شدت سے اُتر گئی تھی۔ اُس نے فوراً رکابی دیگچی پہ ڈھانک دی اور سر پکڑ لیا۔ اُس کا سر بھنّانے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر تک یوں ہی سر پکڑے بیٹھا رہا۔ پھر وہ اُٹھا اور آہستہ سے باہر برآمدے میں نکل آیا۔

برآمدے میں آ کر لکڑی کے کٹہرے سے کہنیاں ٹکا کر وہ چار منزلہ پرانی عمارت سے نیچے راستے پہ دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ کسی پرانے شکستہ قلعے کی فصیل پہ کھڑا ہے اور فصیل کی ایک ایک اینٹ سرکتی جا رہی ہے..! نیچے راستے پہ رنگ برنگی کاریں چیونٹیوں کی طرح قطاروں میں رینگ رہی تھیں۔ کاروں کو دیکھ کر اُس نے سوچا کہ آخر اس کمرے میں اس کی زندگی کب تک رینگتی رہے گی! — پھر اُسے شبہ ہوا کہ کیا یہ کمرہ اس کا اپنا ہے؟ کہیں وہ دوسرے کے کمرے میں تو نہیں چلا آیا؟ — وہ سوچنے لگا۔ اگر یہ دوسرے کا کمرہ ہے تو اس کمرے میں اور اُس کے کمرے میں فرق ہی کیا ہے؟ اس عمارت کے تو بھی کمرے قبروں کی طرح تاریک ہیں! یہ کسی دوسرے کا نہیں اس کا اپنا کمرہ ہے۔ کام سے چھوٹ کر آنے کے بعد اُس نے اپنے ہی کمرے کا تالا کھولا تھا۔ اس بات کا اُسے سو فیصدی یقین ہے۔ یہ سوچ کر وہ دوبارہ پلٹا اور بے دلی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اُس کے اعضا ٹوٹ رہے تھے۔ وہ اب مزید کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ آرام کی خاطر وہ اندھیرے ہی میں چارپائی پہ ڈھیر ہو گیا — نیند تو اُسے آ ہی جائے گی — ✻✻

جلاھے جسم جمہاں

قمر عباس ندیم

اتوار کا دن تھا ....

دوسری اتواروں کی طرح سورج نے بستر کے سرہانے سے طلوع ہو کر معمولات کے ہنگاموں کو پائنتی پر منتظر پایا۔

جاگ تو میں رہا تھا۔

کچھ دیر قبل جب راشدہ نے چائے کی پیالی قریب لاکر رکھی تھی تو میں نے پیالی سے اُٹھتی ہوئی گرم گرم بھاپ دیکھی تھی۔

—— اب میں نے پیالی کو لیٹے لیٹے چھوا تو وہ ٹھنڈی تخ ہو چکی تھی۔

راشدہ بستر سے نہ جانے کب نکل گئی تھی اور بہت سے معمولات سے فارغ ہو کر اب رَدّی والے سے جھگڑ رہی تھی۔ اور یوسف کرسی باہر برآمدے میں ڈالے بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا۔ اب مجھے واقعی اُٹھ جانا چاہیئے۔ لحاف ایک طرف کر کے میں نے ذرا اونچے ہو کر دیکھا۔ میرا خیال اتنا غلط نہیں تھا۔ میرے لڑکے کی سب سے اہم خبر سامنے والے مکان کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھی بظاہر ناخون کاٹ رہی تھی۔ اور یہاں برآمدے میں اخبار پر نظریں گاڑے اپنی دور کی نظر کا اندازہ بھی لگا رہی تھی ——

میں نے ایک جماہی لیکر آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے معلوم ہے کہ ابھی وہ کٹے ہوئے ناخون سمیٹے گی اور انگلیاں ہونٹوں تک لیجا کر مسکرائے گی۔ اور ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر کے دامن جھاڑ کر کھڑی ہو جائے گی۔ دکٹے ہوئے ناخنوں کو تھو تھو کر کے ایک کونے میں پھینک دینا مستحب ہے۔ ورنہ یہ راہ گیروں کے پاؤں میں آکر دشمنی کا سبب بن جاتے ہیں)

اسی وقت یوسف کا اخبار بھی ختم ہو جائے گا اور وہ اپنی ماں سے سودے کے پیسے لیکر کام کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ جس جنرل اسٹورس سے میرے ہاں سودا آتا ہے وہ سامنے والے مکان کے عقبی دروازے کے عین سامنے ہے۔

اب اُٹھ ہی جانا چاہیئے۔ اخبار خالی ہے اور بیوی ردی والے سے اختلافات نمٹا کر بیٹے کو سودا لانے بھیج چکی ہے۔ اور اب وہ چند ٹھنڈی تخ شکایتیں اور گرم ناشتہ میرے لیے لانے کو بالکل تیار ہے۔

اُسے میں نے دروازے سے اندر آتے دیکھا تو میرا دل چاہا آج اسے غور سے دیکھوں۔ وقت کے جھکڑوں میں اس کے بال سفیدی سے اٹ گئے ہیں۔ آنکھوں میں مایوسی اور سپردگی کی عجیب سی کیفیت ہے۔ جیسے زخم اعدا میں گھرے دو سپاہی ہاتھ اُٹھائے، خوف کو چھپانے اور

آنے والے اندیشوں سے چھپنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چہرے پر جھریاں، سانپ کے چھوڑے ہوئے ٹریک کی طرح اُبھر آئی ہیں۔ ہاتھ کی لکیریں اگر آنے والے دنوں کا اشارہ ہیں تو چہرے کی لکیریں گذرے ہوئے وقت کے فنگر پرنٹس)

اُس نے خاموشی سے میرا لحاف تہ کیا۔ اخبار لا کر میرے سامنے رکھا اور کچھ کہے بغیر باورچی خانے میں چلی گئی۔

ایک سگریٹ سلگا کر میں اخبار دیکھنے لگا۔

اُسی دن جو میں نے اُسے غور سے دیکھا اور اس کی آنکھیں کبھی کبھی سی پائیں تو مجھ پر منکشف ہوا کہ بہت سا وقت گذر گیا ہے۔

روشن چمک دار دوپہریں۔ اور راتوں میں گونجتی ہوئی خاموشی جو سونے نہیں دیتی۔ اور وہ میرا اپنا گھر تھا۔ میں بی اے کے امتحان کے بعد ہوسٹل کے ہنگاموں، رت جگوں اور بے نظم زندگی کو خدا حافظ کہہ کر آیا ہوں تو ان اونچی اونچی دیواروں کے پاس میرے لیے اجنبیت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

دیواریں، جنہوں نے مجھے دیکھا تھا اور رشتے ماں، بہنیں، باپ، چچا، وہ سب، جو میں ان سب کے لیے تھا جانتے تھے۔

لیکن ایک چہرہ جو میں نے پہلی بار دیکھا، مجھے انجان بن کر دیکھتا تھا۔ خالی خالی نظروں سے۔

"ارے اسے نہیں پہچانتے — راشدہ ہے یہ......"

تو میں نے اُسے پہچاننا شروع کیا۔ اور اتنا زیادہ کہ اب صورتیں، منظر، رنگتیں، جذبے اسی کے ذریعے سے ہی اپنی پہچان مجھ پر ظاہر کرتے۔

مگر کسی نے اُسے اب تک مجھے پہچاننا نہ سکھایا تھا۔

صحن میں لگے ہوئے جامن کے درخت کو اپنائیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ دوپہر میں اس کے سایہ میں چارپائی بچھا کر لیٹا جا سکتا ہے، خواب دیکھے جا سکتے ہیں — مگر میری طرف —————!

میں تو بس ایک شخص تھا۔ جو اجنبیوں کی طرح اپنے ہی مکان میں آن بسا تھا۔ اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ مصالحہ پیستے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں۔ بال بار بار ماتھے پر آ جاتے ہیں۔ ہاتھ کی پشت سے اس نے لٹوں کو درست کیا۔ آستین پر ماتھا مَس کر کے پیشانی پر پھوٹتے ہوئے پسینے کو پونچھا اور دوبارہ بٹہ سِل پر چلنے لگا۔

تو جب میں نے اپنے آپ کو اس کے بہت قریب کھڑا پایا تو میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا اور وہ بلینک نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی ————

"کھانا پک گیا ہے۔ اماں کو دیکھ رہے ہیں کیا۔؟"

اب رات کو مجھے بہت دیر تک بہت دور تک سوچنا ہے، وہ مجھ سے بے خبر کیا اس لیے ہے کہ اپنے آپ سے بے خبر ہے یا وہ جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کرتی ہے۔

———— اور یہ بے چاری جو اتنی دور سے آئی ہے۔ یہاں کا سارا انتظام سنبھالنے پر کیوں آمادہ ہے۔ کیا میری وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ غریب رشتہ دار کچھ کہے بغیر ہی وہ سارے کام سنبھال لیتے ہیں۔ جو اس کے امیر رشتہ دار میزبانوں نے اپنے دل میں ان کے لیے طے کئے ہوتے ہیں۔ ایسا خاموش معاہدہ عموماً ہو جاتا ہے۔

———— وہ مجھے پسند نہیں کرتی ——— یا شاید ———— وہ ——— وہ ———

صبح کے قریب یہی سوچتے ہوئے مجھے نیند آ جائے گی اور جب دن چڑھے آنکھ کھلے گی تو وہ اتنی ہی لاتعلقی سے مجھے دیکھے گی ————

"میرے کمرے میں دوپہر کو آپ کیا تلاش کر رہی تھیں؟"

"کتاب لے گئی تھی ایک وہ رکھنے آئی تھی"

"کون سی کتاب ————؟"

"میں نے واپس رکھ دی ہے، اماں پوچھ رہی ہیں آپ رات کا کھانا گھر ہی پر کھائیں گے نا ————"

اس نے ایک پرانی میلی سی شال لپیٹ رکھی ہے۔ جس کا کونہ زمین میں لوٹ رہا ہے۔ کبھی اس شال کا رنگ بادامی ہوگا۔ مگر اب تو وہ میلا کورا لٹھا نظر آتا ہے۔

یہ روشن چمک دار آنکھیں جن میں اتنے بہت سے رنگ دیکھتا ہوں خود رنگ کیوں نہیں دیکھ پاتیں ———— اگر ایک سرخ شال ہو یا جیٹ بلیک

تو اس پر کتنی اچھی لگے ـــــ لیکن اُسے تپسیا سے فرصت ہو تو اُسے اچھے لگنے کا مطلب سمجھ میں آئے ـــــ جو خود اپنے جسم کے داغوں سے واقف نہ ہو اُسے وہ جلترنگ کیا سنائی دے گی جو میرے اندر بج رہا ہے ـــــ اتنے مطمئن، غیر متعلق خاموش شخص سے اپنے تعلق کا اظہار کیسے ہو ـــــ

صبح وہ منہ دھو کر تولیہ ہاتھ میں لیے کھڑی ہے ـــ پانی کے قطرے اس کے ماتھے اور گالوں پر سورج کی کرنیں اپنے اندر چھپائے چمک رہے ہیں ـــــ

میں نے اسے اشارہ کیا ـــــ

"مجھے بلا رہے ہیں ـــــ ؟"

سارے لوگ میری طرف دیکھنے لگے ـــــ

"جی ذرا جلدی سے چائے بھجوا دیجیے ـــــ"

اب اس کے علاوہ کیا کہا جائے ـ اب میں صبح سویرے نکل جایا کروں گا، ان کے اُٹھنے سے پہلے ہی، اور رات گئے واپس آیا کروں گا ـــــ ان سے ملاقات نہ ہونا ہی اچھا ہے ـ ـــــ

مگر اس دوپہر اتنا سناٹا تھا ـــ اتنا شور تھا ـــ وہ کمرے سے باہر نکلی تو میں نے راستہ روک لیا ـ

"جی ـــــ"

"ادھر آئیے ـــــ"

وہ ایک قدم میرے پیچھے آئی اور پھر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی ـــــ

"آئیے نا ـــــ"

اب پریشانی جو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر آئی تھی غائب ہو گئی ـــــ وہ بڑے سکون سے میرے پیچھے چلنے لگی ـ

"بیٹھیے ـــــ"

آپ کو کوئی کام ہے ـــــ"

آپ کچھ نہیں سمجھتیں ـــــ"

وہ پڑھنے والی میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی ـ اور دوپٹے کے کونے سے میز پر رکھے ہوئے فریم سے گرد جھاڑنے لگی ـــــ"

فریم میں نے اس کے ہاتھ سے لے لیا ـــ "میں آپ کے لیے ایک چیز لایا ہوں ـــــ" تکیے کے نیچے سے میں نے پیکٹ نکالا ـــ سُرخ شال میرے ہاتھ میں تھی اور وہ آنکھیں جھپکا رہی تھی ـ ـــــ

"میرے لیے ـــــ کیوں ـــــ ؟"

"تم نہیں سمجھتیں ـــــ؟"

"مطلب یہ کہ چچی اماں اتنے دن سے آپ سے اونی شال کو کہہ رہی ہیں ـ آپ ان کے لیے تو لائے نہیں ـــــ اور میرے لیے کیوں ـــــ ؟"

مجھے اُس کی آنکھیں نم نظر آئیں ـــــ سنجیدہ تو وہ بہر حال ہو گئی ـــ

باہر لو چل رہی ہے اور کمرے میں اتنی خاموشی ہے ـــــ اور پنکھے کی روں روں کانوں میں کتنی عجیب لگ رہی ہے ـ

"راشدہ، راشدہ تم کچھ نہیں سمجھتیں ـــــ تم کیوں نہیں سمجھتیں ؟"

اُس نے اپنے ٹھنڈے ہاتھ آہستہ سے میرے ہاتھوں سے چھڑا لیے اور چلی گئی ـــــ

وہ جو ایک انجان سی لڑکی اس گھر میں رہتی تھی اور بڑی بے تعلقی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کاروباری باتیں کیا کرتی تھی کہاں چلی گئی ـــــ

اُس رات میں تو بڑے سکون سے سویا ـــــ مگر وہ شاید جاگتی رہی ـ

ـــــ وہ اپنے آپ سے اب تنی بے تعلق کیوں نظر نہیں آتی ـ اب نظریں اس کے گالوں پر کتنی آسانی سے لالی بکھیر دیتی ہیں ـــــ

وہ پرانی لڑکی جو مجھے اچھی لگتی تھی کہاں گئی ـــــ ؟

شادی تو مجھے اُسی سے ہی کرنا تھی ـ مگر مجھے اب وہ اشتیاق کہاں تھا ـــــ گھر، کاروبار، زندگی، بچے ـــــ جنہوں نے اس پرانی لڑکی کو دیکھا تھا کب کے مر کھپ گئے ـ کھپریلوں اور لکھوری اینٹوں کے مکان، صحن، جامن کے درخت، حوض سب دفن ہو گئے ـ ـــــ

اس گراؤنڈ فلور کے فلیٹ میں میں کرسی پر بیٹھا ہوں ـــ اخبار سے چہرہ چھپائے ہوئے ـــــ دھوپ تیز ہو گئی ہے ـ اندر چلنا چاہیے ـ

"آپ نے ناشتہ نہیں کیا ـــ میں گرم کر کے لاتی ہوں ـــــ"

تم یہ نہ پوچھنا کہ میں نے ناشتہ کیوں نہیں کیا ــــ میں نے اُسے غور سے دیکھا، آج کل تو وہ اور بھی سنجیدہ، گم صم، اور لاتعلق سی نظر آتی ہے۔ اور وہ اس طرح کتنے عرصے سے میرے ساتھ ہے۔ فرمائشیں، عدول حکمی، غصہ، یادیں، کیا یہ سب تم نہیں کر سکتی تھیں ــــ اس نے اپنا جسم اس طرح میرے حوالے کیا، جس طرح بہت گمبھیر خیالوں میں کھوئی ہوئی کوئی ماں اپنے بچے کے منہ میں نپل دیتی ہے۔ ــــ

میں کتنے عرصے اس کے پہلو میں پیٹ بھرے بچے کی طرح غافل سوتا رہا ہوں ــــ

"یہیں بیٹھ جاؤ تھوڑی دیر"

وہ بیٹھ کر ہاتھ سے خیالی مکھیاں جھلتی رہی ــــ

"یوسف آج کل برآمدے میں کیوں ٹہلتا رہتا ہے ــــ ؟"

"امتحان ختم ہو گئے ہیں۔ مصروفیت کوئی ہے نہیں"

"اس کے علاوہ کچھ تم نے غور کیا ہے ــــ ؟"

"نہیں تو ــــ سلائس اور لے آؤں"

"اب یہی پوچھ لیا ہوتا کہ اس کے علاوہ کیا ہے ــــ جو میں جانتا ہوں۔ کم از کم وہ جاننا ہی چاہو ــــ"

آئینے میں میں نے اپنے سفید بالوں کو دیکھا، تیس سال پہلے شاید میں صرف اپنی بات کہہ کر اس کے ردعمل کو ٹھیک طرح جانے بغیر مطمئن ہو گیا۔ وہ شاید کوئی بات کہنا چاہتی تھی۔ جو آج تک نہ کہہ پائی تھی۔ اور وہ بات یہی ہو گی کہ وہ مجھے نہیں چاہتی ــ مگر شادی اس کی میرے ساتھ ہونا ہی تھی اس نے مجبوری میں یہ سودا قبول کیا۔ اور اُسے کاروباری انداز میں نبھانا سیکھ لیا۔

اب اس عمر میں تلافی کس طرح ممکن ہے۔ عجیب سا تلخی کا سا احساس ہوا۔ اور سگریٹ کے آخری کش کی کڑواہٹ حلق میں محسوس ہوئی۔

اور نیند مجھ سے روٹھ گئی ــــ ان دنوں تو وہ اور بھی خاموش نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے گھومتی رہتی ہے۔ لگتا ہے لبس رو دے گی۔ کیا وہ میرے خیالات کو جان گئی ہے ــــ ؟

کتنے دن گذر گئے ہیں، وہ میرے قریب بستر پہ میری طرف پیٹھ کیے لیٹی ہے اور میں لائٹ جلائے بظاہر کتاب پڑھ رہا ہوں ــــ

کیا یہ سو گئی ہے ــــ ؟

اتنے میں لائٹ چلی گئی ــــ

"لالٹین جلا دوں ــــ ؟"

"رہنے دو ــــ" کتاب میں نے ہاتھ سے رکھ دی، اور چشمہ اُتار کر سائڈ ٹیبل پر ٹکا دیا ــــ جاڑے کا چاند کھڑکی سے جھانک رہا ہے۔ اور اپنی سرد سی روشنی کمرے میں بکھیر رہا ہے۔ کھڑکی کے شیشوں سے منعکس ہو کر روشنی چھت پر عین مسہری کے اوپر ہلکورے لے رہی ہے۔

میرا دل چاہا میں اس سے باتیں کروں، وہ جو میں اب تک نہیں کر پایا تھا۔ مگر کیا فائدہ، وہ تو ویسے بھی ان دنوں اتنی غمگین رہتی ہے ــــ

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا ــــ "راشدہ ــــ"

وہ ویسے ہی لیٹی رہی ــــ میں نے آہستہ سے اس کے گالوں کو چھوا۔ اُس کے گالوں پر آنسو تھے ــــ

وہ رو رہی تھی ــــ

ایک دم مجھے شدید اُلجھن ہوئی ــــ میرا دل چاہا سارے دروازے کھول دوں، دیواریں، ڈھا دوں ــــ یا یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میرا دم اُلٹنے لگا ــــ

اُس نے میرا ہاتھ اپنے جھریوں بھرے گالوں سے علیٰحدہ کیا۔ اور پھر مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا ــــ اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی ــــ

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جو اندھیرے میں چمک رہے تھے اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ ــــ

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا ــــ

"کیا ہوا ــــ ؟"

"اختر ــــ" وہ مجھ سے اچانک چمٹ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ــــ

"اختر ـــــ" وہ سُرخ شال تھی نا، تم لائے تھے نا، اُسے کیڑے کھا گئے اختر اتوار کو میں نے اُسے دھوپ دینے کے لیے نکالا، اُسے کیڑے کھا گئے"۔

میں نے اس کے لرزتے ہوئے جسم کو اپنے اور بہت قریب کر لیا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے بہت سے کیڑے ہمارے چاروں طرف رینگ رہے ہیں۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا تو یہ کیڑے ہمیں نگل لینگے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور مجھے یوں لگا جیسے چالیس سال کی گرد میری آنکھوں سے بہہ گئی ـــ اور اب جو میں نے اُسے دیکھا تو وہ کتنی جوان تھی ـــــ

چہرے کی جھریاں، بالوں کی سفیدی، بڑھاپا، نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا ـــــ

لاٹ نہ جانے کب آ گئی ـــــ اور کھڑکی میں جو ایک ہنستا ہوا چہرہ دکھائی دیا تھا وہ نہ جانے کس کا تھا۔ میرا خیال تھا وہ یوسف ہے ـــــ مگر راشدہ کو یقین تھا وہ میں تھا، اور بی اے کا امتحان دیکر گھر لوٹ آیا تھا۔ **

ہزاروں لوگ .....
ہماری چائے کی شہرت سن کر ہی کھنچے چلے آتے ہیں۔
اور واقعی ہماری لاجواب اور بے مثال مٹھائیوں اور عمدہ چائے میں
وہ لذت ہے جسے آپ فراموش کر ہی نہیں سکتے۔
الیاس ریسٹورنٹ
پروپرائٹر: شبیر احمد
چندنپوری گیٹ (نزد پولیس چوکی) مالیگاؤں (ناسک)
اپنا دیش، پھر بھی اپنا دیش ہے .....
جس میں ..... دھنک کی طرح بے شمار رنگ ہیں
جس میں ..... بجلیوں کی چمک اور جگمگاہٹ ہے
جس میں ..... دلکشی، خوبصورتی، اور بے پناہ رنگینی ہے
اسلیے جب بھی پسند کا سوال اٹھتا ہے تو آخری حد اپنا دیشی ساڑیاں ہیں۔
اپنا دیش ساڑیاں
پروپرائٹر: شوال اینڈ کمپنی اسلامپورہ۔ مالیگاؤں (ناسک) مہاراشٹر

چھٹیوں کی آخری شام

یوجینے باربو

محمد سلیم الرحمٰن

یہ ان کی چھٹیوں کا آخری دن تھا۔ ان دونوں کی آپس میں کچھ چخ چخ ہو گئی تھی اور وہ سمجھ رہے تھے کہ اب انہیں ایک دوسرے سے محبت نہیں رہی۔ ریت انہیں سرد اور سمندر اجنبی لگنا چاہیئے تھا مگر انہوں نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔ اگست کے آخر کا وہ دن سمندر کنارے کی سیدھی کھڑی چٹان کے پیچھے کہیں دم توڑ رہا تھا۔ ہرا سمندر شیشے کے مانند تھا۔ چٹیل ساحل سنسان پڑا تھا۔ کبھی کبھار سمندری بگلے نڈر سے انداز میں پر مارتے پاس سے گزر جاتے۔ ٹھنڈ بڑھ چلی تھی اور شام کی الکساتی ہوا جاگ رہی تھی۔ گلتی سڑتی بن جھاڑیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی اور چپٹا سورج، دھند میں لپٹا ہوا، کسی مذبوح ڈنگر کی طرح قرمزی رنگ کا، یوں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اڑوس پڑوس کے ماہی گیری کے اڈّوں کی چھت پر گر پڑا ہو۔ پتھر کی بنی ہوئی بیٹھی سے دھند بھونپوؤں کی آواز آرہی تھی۔ خوامخواہ ہُو ہُو کر رہے تھے کیوں کہ کوئی جہاز آتا دکھائی نہ دے رہا تھا اور آسمان گہرا اور صاف تھا۔

"ہم پھر سمندر میں اترنے لگے ہیں؟" عورت نے مرد کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ہاں" — اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اس برس وہ آخری بار سمندر میں اُترنے کو تھے۔

وہ اُٹھی اور پیدل چلتی ہوئی سمندر میں جا اُتری۔ ننھی ننھی لہریں جنہیں ہوا نے بس ذرا اُبھارا ہی تھا، اُن کے پیروں کو تھپتھپا رہی تھیں۔ ان دونوں کے لمبے سائے پانی پہ پھیل گئے۔ وہ آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ مرد نے ربڑ کے بنے ہوئے فلیپر پہن لئے تھے۔ وہ ہمیشہ فلیپر پہن کر تیرا کرتا تھا۔ وہ عورت کے گرد چکر پہ چکر لگا کر اسے آگے بڑھتے دیکھتا رہا۔ ابھی صرف چند برس پہلے ہی کی تو بات تھی کہ عورت میں ڈباؤ پانی میں تیرنے کا حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ وہ سمندر سے ڈرتی تھی لیکن یہ وقت اتنا سہانا تھا کہ کوئی اندیشہ باقی نہ رہا تھا۔ آج وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح نہیں دیکھ رہے تھے جس طرح کل تک دیکھتے رہے تھے۔ وہ کل کی طرح بلند آواز سے بول بول کر ایک دوسرے کا حوصلہ بھی نہیں بڑھا رہے تھے۔ مرد منہ پھلائے فلیپروں کی مدد سے جلدی جلدی ہاتھ پیر مارتا سمندر میں بڑھتا جا رہا تھا۔

پانی مخمل کی طرح ملائم، لبھاتا ہوا اور پُراسرار تھا۔ گدلی ریتلی تہہ تک ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ چٹان چھوٹی ہوتی گئی۔ نارکول کی بُو ابھی تک باقی تھی اور ماہی گیری کے اڈّوں کے جال پیچھے رہ گئے تھے۔ مرد، پہلے کی طرح بے پروا آگے بڑھ جانے پر تُلا ہوا، عورت کے گرد اپنے دائروں کے گھیر کو چوڑا کرتا گیا۔ وہ چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا، اسے

سکون مل رہا تھا۔ کئی بار وہ غوطہ مار کر تہہ تک گیا اور مچھلیوں کو ڈرا آیا جو ایسی لگتی تھیں جیسے ڈھیروں نیلے نیلے چاقو پانی میں پھینک دیئے گئے ہیں۔ وہ کچھ دیر سیدھا الٹا پانی میں تیرا کیا۔ اور بے رنگ آسمان کو تکتا رہا۔ ایک پرندہ قریب سے گذرا اور اس کی ٹھنڈی برف جیسی نیلی آنکھوں نے اسے جس انداز سے دیکھا اس سے خصومت ٹپکتی تھی۔ ہوا تیز ہو چلی تھی کہ اس کا ہر شام یہی معمول تھا۔

مرد نے مڑ کر پیچھے نظر ڈالی۔ عورت آہستہ آہستہ آرام طلب انداز میں مستانہ وار ٹھیک اس کے سامنے تیر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مرد کے جی میں آیا کہ اس کا نام لیکر پکارے اور ہنسے ——— "بس بہت ہو گئی یہ لغویت ہم بیکار میں ایک دوسرے سے الجھ پڑے!" لیکن اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور پانی پر اس طرح لیٹ گیا جیسے وہ کوئی تکیہ ہو۔ سمندر کا سفید جھاگ کئی بار اس کی کھلی آنکھوں پر سے گذرا ـــ سورج ماہی گیروں کے اڈوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ ریت بھی نیلا ہو گیا تھا۔ جیسے راکھ ہو ـــ چونے دار پتھروں والے کنارے پر بہت اوپر کی طرف دو پیلے کیکر اس برس پہلی بار اپنی پتیاں جھاڑ رہے تھے۔ ہوا نرم اور شفاف تھی۔ وہ موت کے بارے میں، محبت کے بارے میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ کسی تند و تیز شراب کے مانند تھی۔

تیرتے تیرتے وہ ساحل سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ انہیں مطلق تھکن محسوس نہ ہوئی۔ سمندر میں دور نکل جانے پر ایسا لگا جیسے وقت زیادہ دھیرے دھیرے بیت رہا ہو ـــ لائٹ ہاؤس اور جیٹی کے پتھر نظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔ یہاں سکوت گونجتا معلوم ہوتا تھا۔ کوئی بات سوچنا، کسی چیز کی آرزو کرنا ناممکن تھا۔ عورت کو عنقریب طاری ہونے والے خوف کے اولین آثار کا احساس ہوا۔ مرد اسے دکھائی تو دے رہا تھا مگر بہت فاصلے پر معلوم ہوتا تھا ـــ "اگر میرے بازو جام ہو گئے تو؟" ـــ وہ گھبرا کر حیران سی ہوئی۔ "وہ ایسا کیوں جا رہا ہے، وہ بھی آج کے دن؟ ـــ تم تو پہلے بھی سمندر میں اتنی دور آ چکی ہو" ـــ وہ اب اپنی بات کا خود بھی جواب نہیں دے رہی تھی۔ اسے مرد پر تاؤ آ رہا تھا کہ وہ اتنا ہٹیلا کیوں ہے اور کچھ دیر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

ہوا اور تیز ہو گئی تھی۔ مغرب میں آسمان سرخ ہو چکا تھا۔ وہاں چٹانوں کے اوپر ایسا لگتا تھا ہر چیز کو آگ لگی ہوئی ہے۔ سمندر پر تنے آسمان میں ابھی ہاتھی دانت کے رنگ کی چند ایک بدلیاں باقی تھیں، جیسے کسی لحیم شحیم میمنے کی پسلیاں، پانی ٹھنڈا تھا اور دھات کی طرح سخت معلوم ہو رہا تھا۔ ایک زیر آب رو قریب ہی چل رہی تھی۔

"ہماری شاید ڈولفنوں سے مڈبھیڑ ہو جائے" ـــ مرد نے سوچا۔ "پھر وہ ڈر جائے گی اور مدد کے لیے مجھے پکارے گی" لیکن ان میں کوئی ڈولفن نہ تھی۔ مچھلیوں کا ایک غول کا غول مرد کے پاس سے گذرا وہ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے موجوں کی سفید کلغیوں تلے روپہلا سمندری گارا بہا جا رہا ہو۔ مچھلیاں کہ ہزاروں تھیں عجیب انداز سے سائیں سائیں کرتی لمبی لمبی پھرتیلی جنبشوں کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔

ریتیلا کنارہ اب صرف ایک پتلی، پتلی دھجی نظر آ رہی تھی۔ پانی بھی اب پہلے میں سبز نہیں تھا۔ ڈھلے ہوئے جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ تکلیف دہ اور بوجھل بن گیا تھا ـــ "کیا ہم بہت دور نکل آئے؟" مرد نے حیران ہو کر سوچا اور پانی سے اچھل کر باہر آنے کے بعد غوطہ لگایا۔ لہریں اب قدرے بڑی ہو گئی تھیں۔ اور اس کی نظر عورت پر جا پڑی۔ وہ خاصی قریب معلوم ہو رہی تھی اس کا دل چاہا کہ بازو سر سے اوپر لیجا کر عورت کو اشارہ کرے لیکن ایکبار پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ اس نے عورت کے گرد اور بھی بڑا چکر کاٹا۔ ربڑ کے فلیپروں کے سبب اس کے لیے تیراکی آسان اور کہیں زیادہ پر لطف ہو گئی تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے لہروں کو چیرتا آگے بڑھتا گیا اور ارد گرد دیکھنا چھوڑ دیا۔ کھلے سمندر کا پانی ساحل کے قریب کے پانی سے مختلف ہوتا ہے وہ دفعتاً اپنا سارا رنگ کھو بیٹھتا ہے۔ بے کراں نظر آتا ہے اور اس میں کوئی بو نہیں ہوتی۔ وہ اس طرح جی اٹھتا ہے جیسے کوئی زندہ چیز ہو۔ گرم محسوس ہوتا ہے اور بولنے لگتا ہے۔

لہریں بڑی ہوتی جا رہی تھیں اور چاروں طرف سے امڈی آتی تھیں۔ وہ مکار تھیں۔ صرف سمندر ہی اتنا مکار ہو سکتا ہے۔ جھاگ مرد کے ماتھے پر بالوں پر پھیل پھیل گیا۔ جھاگ اس کے نتھنوں اور منہ میں چلا گیا۔

بعض اوقات پانی اُسے یوں لگتا جیسے باڑھ دار تلوار ہو۔ پانی نے اسے تکلیف پہنچائی اور وہ جلن محسوس کرنے لگا۔

عورت کو یوں لگا جیسے وہ برابر ڈوبتی ہی چلی جا رہی ہو۔ لیکن یہ کیفیت اسے ہیبت ناک لگتی تھی۔ اس کا جی یونہی ذرا سا متلایا تو وہ مرد کی تلاش میں نظر دوڑانے پہ مجبور ہو گئی۔ اب وہ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سطحِ آب سے اوپر اٹھ آئی مگر اسے نہ دیکھ پائی۔ اسے یہ تو کبھی پتہ ہی نہ چلا تھا کہ وہ ہے کہاں کیوں کہ وہ سارے وقت اس کا طواف کرتا رہا تھا۔ وہ فکر مند نہیں ہوئی وہ یقیناً کہیں آس پاس ہی ہوگا۔ ذرا دیر میں وہ اس کے سامنے سے گذرے گا۔ وہ تیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور خوش تھی کہ اسے تھکن محسوس نہیں ہو رہی۔ ایک وقت تھا جب وہ کھلے سمندر سے ڈرتی تھی لیکن ایک بار اس ڈر پہ فتح پالی جائے تو کھلا سمندر دوست بن جاتا ہے اور اس پہ پیار آنے لگتا ہے۔

آسمان نے سمندر کا رنگ چرا لیا تھا۔ وہ سبزی مائل اور گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان تلے بھوکی لچھیوں جیسی بدلیاں اڑی جا رہی تھیں اور ساحل نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ آسمان اور پانی کے بیچوں بیچ تھے۔ تماشہ یہ کہ اس طرح سیدھے پڑے پڑے تعجب اس پہ آتا ہے کہ آدمی اس بے قرار سطح پہ سے کیسی اور جا کر گرتا بہا نہیں۔ ساحل کے قریب کی لہروں سے کچے تربوزوں کی سی باس آتی تھی۔ لیکن یہاں پہ یہ لہریں ذائقے اور گرماہٹ دونوں سے محروم ہو چکی تھیں۔

مرد نے پانی سے اٹھ کر سمندر پہ نظر ڈالی۔ پانی میں کوئی بھی نہیں تھا۔

اُس نے دوبارہ غوطہ مارا کانوں پہ گہرے پانی کا سن کر دینے والا دباؤ محسوس کیا۔ وہ تڑپ کر پانی سے باہر آیا اور دوبارہ پانی میں جا گرنے سے پہلے پل بھر کے لیے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں سمندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

عورت نے اپنی نظر دائیں طرف گھمائی، پھر بائیں طرف مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ وہاں سمندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ پکارنے لگی ——

مرد نے ایک بار پھر غوطہ لگایا۔ پھر سو نے سمندر پہ نگاہ ڈالی اور پکارنے لگا ——

سمندر یوں لگتا تھا جیسے اُبل رہا ہو۔ یہاں اگست کے اواخر کی سہانی روشنی میں سمندر اکیلا اور بلوان تھا اور گھٹی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ خاموشی کافور ہو چکی تھی۔ سمندر گرجا، مرد نے دائرے کو چھوٹا کرتے ہوئے تیز تیز تیرنا شروع کر دیا۔

"یقیناً وہ یہیں کہیں ہو گی۔ یہ طے ہے۔" زور مارنے کی وجہ سے اس کی باہیں دکھنے لگیں۔ اس نے آواز دی۔ کوئی جواب نہیں۔

عورت نے ایک بار پھر اوپر اُٹھ کر سمندر پہ نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس نے زور سے آواز دی۔ ایک سمندری بگلا اسے سرد مہر، نیلی، خشم آلود آنکھوں سے دیکھتا ہوا گذرا۔ وہ اکیلی تھی۔ وہ چلائی۔ کوئی جواب نہیں۔

"میں کہاں چلی جا رہی ہوں؟" وہ اچانک سہم کر حیران ہوئی۔ "مجھے ساحل کا رُخ کرنا چاہیئے۔"

اور وہ ساحل کی طرف مڑ گئی۔ لیکن خوف زدہ تھی۔ فرض کرو وہ ڈوب گیا!

"وہ ڈوب نہیں سکتا وہ بہت اچھا تیراک ہے۔"

"کہیں وہ —— ؟"

"نہیں یہ ہو ہی نہیں سکتا! ——"

اس نے پھر سمندر سے اُبھر کر آواز دی۔ کوئی جواب نہیں ——

مرد نے پھر غوطہ مارا اور خود کو پانی پہ چت ہو جانے دیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سکوت میں ڈوبا سمندر سیاہ اور سفاک معلوم ہو رہا تھا۔ یک بیک ہوا تھم گئی اور ارد گرد موجیں کسی اترے لبادے کی طرح، بے جان ہو کر ڈھیر ہو گئیں۔ اس نے آواز دی کوئی جواب نہیں۔

لائٹ ہاؤس اور کنارہ اب نظر نہیں آ رہے تھے ——

"مجھے واپس جانا چاہیئے" —— اس نے خود سے کہا۔

"اور جو وہ ڈوب گئی ہو —— نہیں! —— یہ ممکن نہیں!!"

"کہیں وہ پانی سے ڈر نہ گئی ہو؟ —— اب اسے پانی سے ڈر کہاں لگتا ہے۔"

مرد نے دوبارہ ابھر کر آواز دی، کوئی جواب نہیں۔ پھر وہ رونے اور زور زور سے چیخنے لگا —— جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہو۔

"تم نے اسے اکیلی کیوں چھوڑ دیا —— تم نے اسے اکیلی کیوں چھوڑ دیا؟"

اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ سمندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سمندر اب پرسکون تھا۔ وہ اسفالٹ جیسا تھا۔ اور بیابانوں سے عون غاں کر رہا تھا۔

"اگر میری مدد میری مدد کی ضرورت پڑی اور میں اس کے پاس نہ ہوا تو؟ میں کس منہ سے واپس جا سکتا ہوں"۔

اسے یوں لگا جیسے عورت کی آواز سنائی دی اور وہ دوبارہ پانی سے اُبھر آیا۔ اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔

عورت روتی ہوئی گرتی پڑتی ساحل کی طرف بڑھتی رہی۔ اس نے پانی سے سر باہر نکال کر گلے کا پورا زور لگا کر آواز دی، مگر کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ "اگر وہ ڈوب گیا ہے تو میں لوٹ آؤں گی"۔ اس نے فیصلہ کیا۔

"شاید وہ مجھے ڈرانا چاہتا تھا...... فرض کرو وہ ساحل پر مجھے نہیں ملتا"؟ خوف نے اس کا گلا جکڑ لیا اور اسے کہیں جلدی تھکا مارا۔

مرد نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ ساحل پر نہ ملی تو وہ لوٹ آئے گا۔

اور وہ رات ہونے تک روتے ہوئے ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے تیرتے رہے پھر تھکن سے چور ہو کر پھر ایک دوسرے آملے، جہاں اب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ***

وقت کی آنکھ

فروزاں علی

میں کوریڈر میں کھڑی کافی دیر سے اسما کا انتظار کرتی رہی۔

نہ جانے کہاں رہ گئی ــــ پائنٹ کی بسیں جانے میں چند ہی منٹ رہ گئے۔ میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا ــــ

سارا ڈپارٹمنٹ خاموشی کے گہرے سناٹے میں ڈوب رہا تھا۔

کیا کروں؟ دل نہ جانے کیوں اداس ہے ۔ کوئی بھولا بھٹکا طالب علم اپنے تیز تیز قدموں سے پاس سے گزر جاتا اور کچھ دیر دل کی ویرانی میں اس کے قدموں کی چاپ گونجتی رہتی ــــ

"اب آ بھی جاؤ اسما ڈیئر!"

میں انتظار کرتے کرتے تھک سی گئی۔ دل سے سر ٹکایا تو یوں لگا جیسے نیلے آکاش پر سفید بادل ہلکورے کھا رہے ہوں اور آنکھوں کو بڑی ملائم سی ٹھنڈک چھو رہی ہو ــــ مگر لان میں بکھری تیز دھوپ سے وحشت سی ہونے لگی۔ میں نے دھیرے سے اپنی آنکھیں بند کرلیں ــــ اور یوں محسوس ہوا جیسے چشمے کا ٹھنڈا پانی خشک گلے کو تر کر گیا۔

"معاف کیجئے گا!" اچانک آواز آئی ــــ

میں نے پلٹ کر دیکھا، یونین کا سکریٹری کھڑا تھا ــــ

"گستاخی معاف، سوال ذاتی ہے ۔ مگر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں آپ اس وقت کیوں کھڑی ہیں؟"

میں تھوڑی دیر اس کے سوال میں کھوئی رہی۔

"جواب دیجئے"ــــ

"آپ کو کوئی اعتراض ہے!" میری آنکھوں میں غصہ اتر آیا ــــ

"جی نہیں، بھلا میں اعتراض کرنے والا کون؟" ــــ اس نے تیکھے لہجے میں طنزیہ مسکراہٹ سے کہا اور چلا گیا۔

مگر میرے تن بدن میں وحشت سی ہونے لگی ۔ آخر اس کے اس جملے اور مسکراہٹ کا مطلب کیا ہے؟ میرے ذہن میں سوالات کے بگولے سے اٹھنے لگے۔

"تو تم نہیں آوگی اسما بیگم! چلو یہ بھی ٹھیک ہے" اس کے جملے کا اثر میری رگ رگ میں غصہ بن کر اترنے لگا ــــ میں وہاں سے چلنے لگی، اب کہاں جاؤں؟ ــــ

دور دور لڑکے اور لڑکیوں کے جوڑے سر سے سر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے ۔ ناگواری کا تیز احساس میرے دل میں اتر آیا ــــ تو سکریٹری صاحب تم نے ٹھیک ہی کہا تھا ــــ مگر تمہارا تیر

غنودگی —— میں نے ایک بار پھر ان "پیرس" (PAIRS) کو دیکھ کر سوچا ——

جامعہ کو اس طرح بدنام تو نہ کرو میرے دوستو! دکھ کے سائے میرے دل میں بڑھنے لگے۔ مگر اس میں ان کا کیا غلطی؟ دل نے ہولے سے سر اٹھایا۔ لیکن اخلاقیات کا بھی تو بڑا وسیع مفہوم ہے۔ اس نے بھی تو دنیا میں بڑی ترقی کر لی ہے۔ مگر شاید اخلاقیات کا سبق پڑھتے پڑھتے ورق پلٹ گئے ہوں اور ہم اتنے آگے بڑھ گئے ہوں جہاں اخلاق حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔

ہاں ایسا ہو سکتا ہے! جب بادِ صرصر چلتی ہے تو دماغ میں جلنے والا چراغ بجھ جاتا ہے —— اور دل میں جذبات کی ایسی آگ لگتی ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

مگر وہ تو کہا کرتا تھا کہ جب خزاں آتی ہے تو اس کے پس پشت بہار بھی دبے قدموں آتی ہے —— میرا ذہن بکھر بکھر کر سمٹ رہا تھا۔

مجھے اس بہار کا انتظار ہے! مگر نہ جانے یہ طویل خزاں کب رخصت ہوگی؟ میں کس سے اپنے سوال کا جواب مانگوں؟ وقت کے ان بکھرے ہوئے لوگوں سے جو ایک گوشے میں دنیا و مافیہا سے بےخبر اپنے مستقبل سے بے نیاز بیٹھے ہیں ——!

میرا ذہن سوچتے سوچتے ماؤف ہو جائے گا! مگر آخر تم لوگ اپنے معاشرے کو کیوں نہیں سمجھتے ہو۔ ان اقدار کی گہرائیوں میں کیوں نہیں اترتے؟ ان کے چہروں پر سے اپنے غلط اٹھنے والے قدموں کی دھول کو صاف کر کے تو دیکھو! تمہیں اپنے احساسات و جذبات اور شعور کی غلط بیداری کا جواب بھی مل جائے گا صرف ماضی کے سینے میں اتر کر دیکھنا پڑے گا پھر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کونسا مستقبل ہے جس کی جانب ہم بڑھ رہے ہیں۔ ؟ ——

مگر مگر میں' اچانک میرے سر میں درد اٹھا اُف میں درد کی شدت سے فریب کی دنیا میں واپس آ گئی —— ذہن میں آئے طوفان سے بچنے کے لیے میں لائبریری کی طرف بڑھ گئی —— لائبریری اپنی تمام جلوہ افروزی کے ساتھ پر رونق تھی —— میں نے کتاب کھول کر سامنے رکھی اور دل کے ویران صحرا میں گھومتی رہی۔

مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے —— میں نے دوبارہ کتاب میں دل لگانا چاہا —— مگر وقت بہتے دریا کا نام ہے۔ جو پانی بہہ جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا اور جو پھول گر جاتے ہیں وہ دوبارہ شاخ پر نہیں لگ سکتے۔ میں پورے پونے تین پر لائبریری سے اٹھ گئی ——

"ارے تم ——!" اچانک میری نظر فاروق پر گئی —— "کیا لکھ رہے ہو؟ شاید کوئی تنقید ہے؟"

"ہو تو کافی عقلمند!" اس نے ہنستے ہوئے کہا ——

"کس چیز پر ہے؟ ——"

"کچھ نہیں' یوں ہی ذرا کچھ لکھ رہا ہوں ——"

"پھر بھی کیا ہے جاتے انہماک سے لکھ رہے تھے" —— میں نے زور دے کر پوچھا۔

"سیاسی نظریات پر تنقید ہے۔ یعنی ہمارے سیاسی مفکرین نے جو نظریات پیش کئے ہیں ان پر تنقید ہے"

"اُن کے نظریات پر تنقید لکھنے سے کیا فائدہ؟' یہ تو ہمارے لیے لاحاصل ہے لکھو تو کوئی ایسی تصویر لکھو جو ہمارے اس وقت کے حالات کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہو۔"

اس وقت تو میں تنقید کچھ اس طرح کر رہا ہوں کہ آیا ان سیاسی مفکرین نے جو نظریات ہمیں دیے ہیں وہ ہم پر منطبق ہو رہے ہیں یا نہیں' اور اگر نہیں ہو رہے ہیں تو کیوں؟ اور اگر اس میں کچھ کمزوریاں ہیں تو وہ اس وقت کیوں ظاہر ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے وہ ہمارے اپنے دور' وقت یا زمانے کے کسی قسم کے بحران کا نتیجہ ہیں' تو بس میں اسی بحران کو تلاش کر رہا ہوں' ان کمزوریوں کو اجاگر کر رہا ہوں جو ظاہر نہیں ہو رہی ہیں یا جن کی وجہ سے ہماری ترقی کا پلڑا کسی سے جھکا ہوا ہے۔

"بہت اچھے خیالات ہیں تمہارے! مجھے محسوس ہوا جیسے خوشی میرے چہرے سے عیاں ہو رہی ہو۔ میری خوشی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مسلمہ تم کافی ذہین ہو اور یہ تو ایک عام سی بات ہے نہ جیسے جیسے

وقت گذرتا جاتا ہے انسانی خیالات میں تبدیلی آتی جاتی ہے ۔ زندگی کے بیشتر عوامل بدل جاتے ہیں اور نئے اس کی جگہ لے لیتے ہیں ۔ ان اساتذہ اور مفکرین نے اپنے جو خیالات دیئے ہیں وہ ان کے وقت کے لحاظ سے بالکل صحیح تھے اور اپنے وقت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات سے ہی حکومتیں بدلتی ہیں اور انقلاب آتے ہیں ۔

"اب ہمیں ان نظریات کو اپنے لحاظ سے تراش کر اپنے لیے سنوارنا ہے ۔ اس طرح ہم نسل در نسل ارتقار کی طرف بڑھتے جائیں گے ۔"

وہ بولتا رہا اور میں سوچتی رہی ۔ اور مجھے اس کی آنکھوں میں وہ شعلہ لپکتا ہوا نظر آیا جس سے ساری دنیا کو روشن کیا جا سکتا ہے ۔ وہ بولتا رہا اور میں سوچتی رہی زندگی کے اصل چراغ تو یہی ہیں ۔ ہم کیوں انفرادیت پر مرتے ہیں؟ کیوں صرف اپنی ذات تک محدود ہیں ، ہمیں اجتماعیت کا نقطہ سیکھنا چاہیئے کیونکہ سورج کسی ایک رنگ کا نام نہیں ، بلکہ سات رنگوں کی آمیزش کا نام ہے
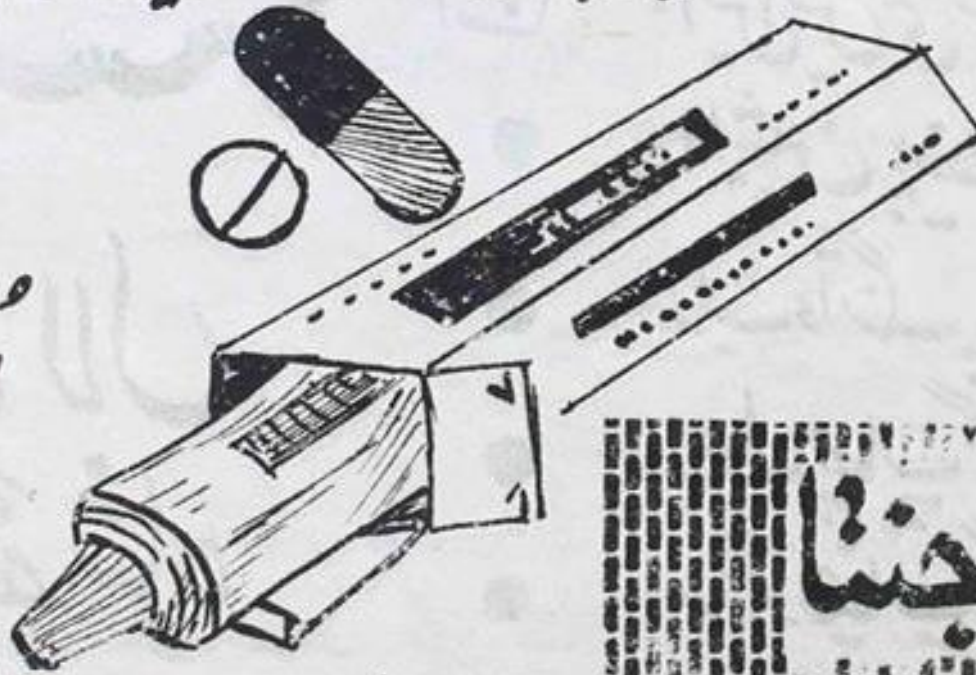
**

عصری ادب میں حرارت پیدا کرنے کے لیے

ہم زبان کی جانب سے ایک اہم اعلان

قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر آئندہ شمارے سے دو مستقل عنوان ایک ساتھ شروع کئے جا رہے ہیں ۔ یہ دو ایسے سلسلے ہیں جو ادب کے تعلق سے بہت سارے نئے یا مخفی گوشوں کو سامنے لائیں گے ۔ نیچے دو عنوان دیئے ہوئے ہیں ۔ ان میں سے کسی بھی ایک پر آپ اپنے قلم کو حرکت میں لائیے ۔ یہ صفحہ ہند و پاک اور بنگلہ دیش کے ہر بڑے اور چھوٹے فنکار کو لکھنے کی دعوت دیتا ہے ۔ یقین ہے ان دونوں عنوانات پر اُردو کا ہر ادیب متوجہ ہوگا ۔

١ ۔ "میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش لمحہ"

ہماری زندگی بے شمار کہانیوں سے بنی ہوئی ہے ۔ اگر ہم اپنے پیچھے مڑکر دیکھیں تو بے شمار واقعات مختلف کہانیوں کے رنگوں میں بکھرے ہوئے نظر آئیں گے ۔ ہم زندگی میں طرح طرح کے حادثات سے دوچار ہوتے ہیں ۔ قدم قدم پر ہمیں زندگی، دنیا، ماحول اور مختلف کرداروں کا تجربہ ہوتا ہے ۔ سفر میں، کسی اجنبی مقام پر، اپنے شہر میں، اپنے گھر میں، آفس میں، راستے پر یا کسی بھی مقام پر کبھی کبھی کوئی ایسا لمحہ ہم سے ضرور آ ٹکراتا ہے جو یقیناً ناقابلِ فراموش ہوتا ہے اور اسی لمحہ کو صحیح طور پہ محسوس کرنے، سمجھنے اور اسے پوری تہذیب کے ساتھ بیان کر دینے کو کہانی کہتے ہیں ۔ آپ بھی اپنی زندگی کے سارے واقعات کو پلٹ کر دیکھئے ۔ کوئی لمحہ ایسا ضرور ہوگا جسے آپ ابھی تک بھولے نہ ہوں گے ۔ اس لمحہ کو لفظوں میں اتاریئے "ہم زبان" کے صفحات اس لمحہ کے خیر مقدم کیلئے کشادہ ہیں ۔

٢ ۔ "میرے لکھنے کا سبب؟"

بظاہر یہ عنوان عجیب سا لگتا ہے اور کئی دہائی قبل کے ایک مشق شدہ عنوان "میں کیسے اور کیوں کر لکھتا ہوں" کی یاد تازہ کرتا ہے ۔ مگر یہ عنوان اس سے کافی مختلف ہے ۔ کیوں کہ اب "کیسے اور کیونکر" لکھنے کا زمانہ نہیں رہا ۔ ہم اس عہد میں سانس لے رہے ہیں جو ہزاروں مسائل میں اُلجھا ہوا ہے ۔ یہ سچ ہے ہم خوامخواہ نہیں لکھتے ۔ ہمارے لکھنے کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب ضرور متحرک ہے جو ہماری ساری تحریروں کا نقطۂ آغاز ہے ۔ اگر عنوان پر غور کیا جائے تو بے شمار سوالات پیدا ہو جاتے ہیں ۔

آپ اس عنوان پر سوچیے ۔ اپنی تحریروں کا جائزہ لیجیے اور بتلایئے آپ کے لکھنے کا سبب کیا ہے ؟

(ادارہ)

مزدوروں، محنت کشوں اور عام مسلمانوں کو عید کی پرخلوص مبارکباد
تھکے ہوئے اور بے کیف
ذہنوں میں سرور کا خوشگوار
موڑ پیدا کرتی ہے
ہر موڑ پر، ہر محفل کی،
اور ہر ایک کی
ایک ہی پسند!
اسماعیل بیڑی
میسرس اسماعیل بفاتی حاجی
بیڑی کارخانہ ۔ مالیگاؤں (ناسک) مہاراشٹر
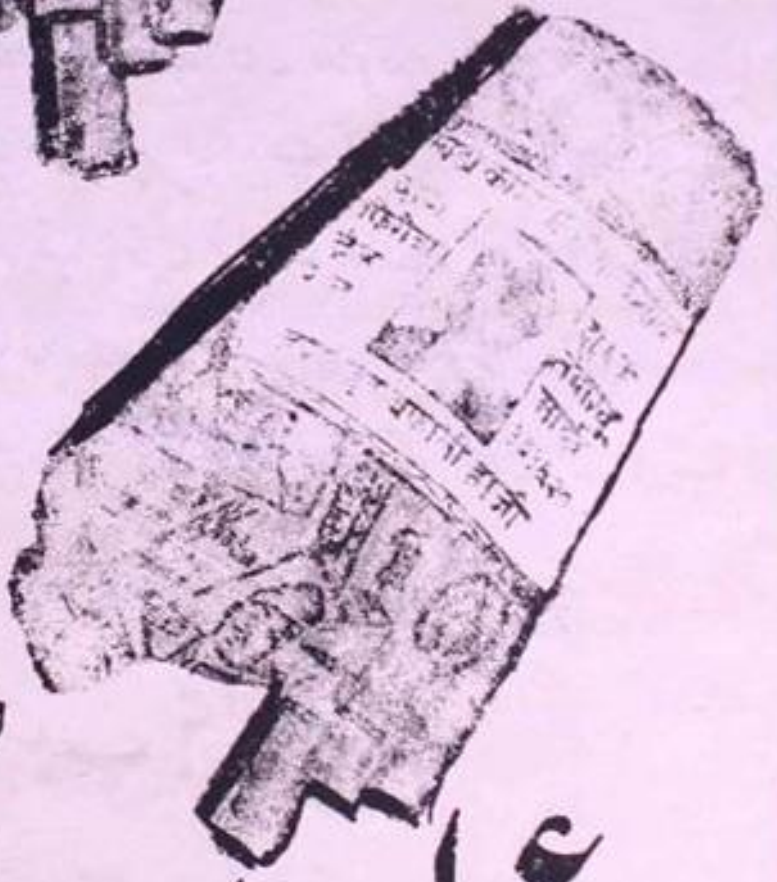
احتساب

الفاظ کا سفر

مصنف : ظہیر غازی پوری

صفحات : ۱۶۰

قیمت : دس روپے

ناشر: مکتبہ آورش، "آنگن" بنیاد گنج، گیا (بہار)

اُردو کا اشاعتی میدان اب کافی وسیع ہو چکا ہے، اب ہر ماہ بیسیوں شعری، ادبی اور تنقیدی کتابیں بازار میں آنے لگی ہیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن پر نظریں آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ ظہیر غازی پوری کا پہلا شعری مجموعہ "الفاظ کا سفر" بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ مضا ابن فیضی، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر عنوان چشتی اور کرامت علی کرامت نے مصنّف کا تعارف لکھ کر اس کتاب کا وزن اور بڑھا دیا ہے۔

ظہیر اپنے اسلوب اور لب و لہجہ کی وجہ سے جدید شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن الفاظ کا سفر کی اکیاسی ۸۱ غزلوں اور چالیس ۴۰ نظموں کے لاتعداد اشعار اور کچھ نظمیں ہیئت اور اسلوب سے قطع نظر "جدید ڈکشن" کی فضا سے پورے طور پر ہم آہنگ نہیں ہے۔ کہیں کلاسیکی نغمگی ہے اور کہیں فرد اور معاشرہ کے مسائل کا تذکرہ "الفاظ کا سفر" صرف اندرونِ ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ سفر ماحول اور سماج کی پُر پیچ گلیوں اور شاہراہوں پر بھی ہوتا ہے۔ ؎

ہم ہیں کس آشوب کا پرتو پوچھ ذرا آئینوں سے
جسم ہیں سارے خوں آلودہ چہرے ہیں سب دھول اٹے

بم پھٹے، لوگ مرے، خون بہا، شہر لٹے
اور کیا لکھا ہے اخبار میں آگے پڑھئے

کہاں سے چھا گئی چہروں پہ گردِ ویرانی
حیات بخشنے والا اگر اُداس نہ تھا

لمحہ لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کے حوالوں اور اس کی شکستوں کے کرب کو صنعتی اور نیو کلیائی ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لیے نئی علامتوں اور نئے اسلوب و ہیئت کا استعمال ہی جدیدیت ہے۔ جدید شاعری تشبیہات، استعارات، لفظیات، علائم اور امیجری کے نئے پن سے پہچانی جاتی ہے۔ ظہیر کی شاعری اس رنگ کی نمائندہ نہیں، البتہ جدید غزل کا سا بیانیہ انداز ان کے یہاں ضرور ملتا ہے جن میں گہری معنویت کے ساتھ شاعر کا تجربہ یا تاثر عصری حسیت سے ہم آہنگ ہوتا ہے ؎

پڑتی نہیں اب اس پہ اچٹتی نگاہ بھی — پچھلے دنوں کا نیے ہو اخبار زندگی

میرے احباب پہ الزام نہ آئے تو کہوں
اپنے ہی شہر میں آوارہ بھٹکتا ہوں میں

بعض اشعار میں ایک ایسی تصویر کا ہیولا (شعری پیکر) نظر آتا ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا مگر قاری شاعر کے مافی الضمیر کو سمجھنے میں ذرا بھی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ظہیر کے یہاں وہ ابہام اور کھردراپن نہیں ہے جو جدید شاعر کا خاصہ ہے۔ اس کا سبب ہے لفظ کا انتخاب اور اس کی فطری نشست جس سے ایک مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ ایک لڑی میں پروئے سے لگتے ہیں ؎

تازگی چہرے پہ ہے کچھ تو غنیمت جانو
ورنہ جلتے ہوئے سورج کی تمازت ہوں میں

مجھے نہ روکتا احساسِ خوش لباسی تو
حیات، میں تجھے بیوہ کی چوڑیاں لکھتا

اس کتاب میں غیر صحت مند یا پراگندہ لمحات میں کہی گئی غزلیں یا اشعار بھی موجود ہیں جو ایک سنجیدہ اور ذہین قاری کے لیے کوفت کا باعث ہیں۔ ؎

ہلکے لباس جسم پہ ان کے، یہ سردرات
شانوں پہ اپنے ظہیر کوئی شال ڈال دو

سگریٹ، گلاس، چائے کا کپ اور ننھا لیمپ
سامانِ شوق ہیں یہ بہم میری میز پر!

دیوان ہے گراں اگر اشعار کا مرے
یہ بھی بہی کہ دام مجھے دو تہائی دو

مدیر سے ذرا تعریف خط میں کر دینا
مری غزل میں اگر کوئی شعر اچھا ہے

اس قسم کے تقریباً پچاس اشعار بآسانی مل سکتے ہیں جن میں ظہیر صاحب فکری اعتبار سے بونے نظر آتے ہیں!

زیرِ تبصرہ شعری مجموعہ کا حصۂ نظم موصوف کے کسی مخصوص رویّہ کی نشاندہی نہیں کرتا۔ زبان و بیان کی جو خوبیاں غزلوں میں پائی جاتی ہیں نظمیں ان سے عاری ہیں۔ اُداس کیفیت کی حامل نظموں میں روایتی انداز اور کلاسیکی رنگ پایا جاتا ہے۔

خوف، یاسیت، شکستگی، فرد، سماج اور عصرِ نو کے پیدا کردہ مسائل جن سے آج کا انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر دوچار ہے نظموں کے بنیادی کردار ہیں اور یہ کردار پہلی نظم "الفاظ کا سفر" سے لیکر آخری نظم "تغیرات" تک ہر آن اور ہر مرحلہ نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے سفر کرتے ہیں۔ مختصر نظموں میں "وقت، ترغیب، المیہ، اندیشہ، سعیٔ رائیگاں، ماتم اور ...... ! کے اخراج سے حصۂ نظم کے وزن اور تنوع میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔

مجموعی طور پر "الفاظ کا سفر" نئے اسلوب اور نئے لب و لہجہ کا سفر ہے اس لیے اس سفر کے دوران ملنے والے سبھی مناظر کے رنگ اس شعری مجموعہ میں پائے جاتے ہیں۔ ——— **شہزاد عثمانی**

ہم تینوں

مصنف : غمگین غلام نبی قیمت ۵ روپئے ۵۰ پیسے
ناشر : روحی پبلیکیشنز، سرینگر ۱۹۰۰۰۱ کشمیر
ملنے کا پتہ : بیوٹی سنیٹر، پی ڈبلیو ڈی روڈ بارہمولہ کشمیر

ہم تینوں تین ایسے نوجوانوں کی کہانی ہے جنہیں ناکامیوں اور محرومیوں نے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مگر پھر بھی وہ زندہ ہیں اور زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف بھی! مدن اور اکرم انڈر میٹرک ہیں لیکن ان کا تیسرا ساتھی جو اتفاق سے کہانی کا راوی بھی ہے ایک تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان ہے۔ جس کے پاس قابلیت ہے لیکن روپیہ نہیں۔ صلاحیت ہے لیکن سفارش نہیں اس لیے اُسے کہیں بھی ملازمت نہیں مل سکی۔ مفلسی تینوں دوستوں میں قدرِ مشترک ہے۔ اور شاید یہی ان کی دوستی کی اساس بھی ہے۔ کہانی کا راوی جاگتے میں خواب دیکھنے یا پھر خیالوں میں ڈوبے رہنے کا عادی ہے۔ اسی لیے وہ اکثر منظر سے پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

اس وقت مصنف کے قلم سے ایسے تیکھے جملے ادا ہوتے ہیں کہ قاری چونک اُٹھتا ہے۔ ایک معمولی سی میوے کی دکان جو اکرم کی ہے۔ مدن اور کہانی کا راوی بیٹھے ہیں اور یہیں سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ کہانی آگے چلتی ہے۔ انسانی فطرت اور جبلت پر سے نقاب اُترتی چلی جاتی ہے۔ اور آدمی اپنی ساری فطری کمزوریوں اور جبلی خواہشوں سمیت عریاں ہو جاتا ہے۔ یوسف، زوبی، ریتا، مِسٹر دت، اکرم، مدن اور خود کہانی کے راوی کا کردار ہماری زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتا ہے۔ ان کرداروں کی کمزوریوں اور اندوہناک حالاتِ زندگی میں عام انسانی زندگی کا کرب جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ مصنف نے اپنے گرد و پیش میں جو کچھ دیکھا ہے اُسے بڑی فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کر دینے کی کامیاب کوشش کی ہے گو کہ انہوں نے زندگی کا ایک خاص زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قنوطیت کا بڑا گہرا سایہ اُن کے کرداروں پر محیط ہے۔

اس کہانی کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ بڑی غلی فارمولے ٹائپ کی ہے۔ آغاز سے انجام تک! تین زندہ رہنے کی کوشش کرنے والے نوجوانوں کو پیش آنے والے حادثات کے سہارے یہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اور جہاں سے کہانی چلتی ہے۔ وہیں پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ کہانی کا راوی اکثر منظر سے غائب ہو کر پس منظر سے خطبہ دینے لگتا ہے۔ "لاکھوں میں کھیلنے والو۔ آؤ، دیکھو! دو پیسوں کے لیے تین جانیں تڑپ رہی ہیں۔ تین روحیں مضطرب ہیں۔ ہمارے پاس دو پیسے نہیں اور ایک تم ہو کہ ایک بوسے کے سینکڑوں خرچ کر دیتے ہو۔ کہاں ہو سماج کے ٹھیکیدارو! " وغیرہ وغیرہ اس طرح کے طویل پیراگراف جو ناول میں جگہ جگہ موجود ہیں قاری کا تسلسل اکھاڑ دیتے ہیں۔ یہ پیراگراف جو کسی سیاسی مزدور لیڈر کی تقریر کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اگر ناول سے حذف کر دیئے جائیں تب بھی اس سے کہانی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ کیوں کہ کرداروں کی زندگی خود اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو قاری سے منوا لیتی ہے۔ "تقابلی موازنے" کا یہ کام مصنف کو قاری کے فہم و ادراک پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اس سے ناول کی اثر پذیری اور بڑھ جاتی۔

کہانی کا راوی ایک ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوان ہونے کے باوجود ایک منسٹر کے صرف اخباری بیان پر کہ "ملک میں کسی نوجوان کو بیکار نہیں رہنے دیا جائے گا" اپنی نوکری کی سفارش حاصل کرنے کے لیے سکریٹیریٹ جا پہنچتا ہے اور سکریٹیریٹ پر نظر آنے والی بھیڑ کے بارے میں خیال کرتا ہے کہ یہ سب بھی میری طرح نوکری کی سفارش حاصل کرنے کے لیے منسٹر صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح کہانی کا انجام بھی بڑا (Un Natural) غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔

کہانی کے راوی کو ریتا کے اثر رسوخ کے سہارے ایک ڈیلی اخبار میں سب ایڈیٹری جگہ ملتی ہے۔ اُسی آفس میں وہ اپنے بیکار ساتھی مدن کو بھی چپراسی کی نوکری دلا دیتا ہے۔ اور یوں ان کے دن پھرنے کے آثار پیدا ہوتے ہی ہیں کہ ایک دن ایک ہوٹل میں تینوں دوست "یومِ نجات" منانے کے لیے جاتے ہیں، وہاں ان کی ملاقات ریتا کے شوہر مسٹر دیک کمار سے ہوتی ہے۔ یہ تینوں اُسی کی میز پر چلے جاتے ہیں۔ اور پھر جام پر جام خالی ہوتے ہیں۔ وہیں اخبار کے ایڈیٹر مسٹر دت بھی پہنچ جاتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں مسٹر دت ریتا کے بارے میں ایک گندہ ریمارک پاس کرتے ہیں۔ ریتا کا شوہر بھڑک اُٹھتا ہے اور شراب کا جام مسٹر دت کے چہرے سے ٹکراتا ہے۔ کہانی کے راوی کے لیے بھی یہ بات ناقابلِ برداشت تھی لہٰذا اُس کا جام مسٹر دت کے سر پر ٹوٹتا ہے۔ اور پھر اکرم اور مدن بھی پیچھے نہیں رہتے۔ اس "معقول دھیبے" کی پاداش میں مدن اور کہانی کا راوی نوکری سے برخاست کر دیئے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت جب یہ اوبیے ہوٹل سے اُداس اور غمگین ہو کر نکلتے ہیں۔ آگ لگنے کا شور بلند ہوتا ہے اور یہ آگ ٹھیک اُسی عمارت میں لگتی ہے جس کی پشت پر اکرم اپنا ٹھیلہ رکھتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اکرم کا بھی سب کچھ جل گیا ہے۔ اب پھر یہ تینوں دوست پہلے ہی کی طرح بے کار ہو جاتے ہیں اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

کہانی کی ان کمزوریوں کے باوجود مصنف نے اپنی فنی واقفیت سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ طرزِ نگارش کی سادگی اور روانی نے کہانی میں

جان ڈال دی ہے۔ یہ ناول واحد متکلم کی تکنیک میں لکھے جانے کے باوجود اثر پذیری میں کامیاب ہے۔ —— **شبیر ہاشمی**

اِعراض

شاعر : رئیس مالیگانوی

قیمت : دس روپے

ملنے کا پتہ : بزم جمال، مومن پورہ ۔ مالیگاؤں (ناسک)

ملک میں اول تو خوبصورت شعری مجموعے شائع ہوتے ہی نہیں اور اگر شائع ہوتے بھی ہیں تو فروخت نہیں ہوتے ۔ یہ بات اس وقت سے میرے ذہن میں محفوظ تھی جب کالے پیلے کاغذ پر اندھی نظمیں اور کالی غزلیں چھاپنے کا رواج نیا نیا تھا اور خوامخواہ کے بھدّے اور کھردرے پن کو "نئی دریافت" کے طور پر زبان و ادب (اور کتابت و طباعت) کا بلند درجہ قرار دیا جا رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حسن کا معیار اس حد تک تبدیل ہو سکتا ہے ۔ لیکن ابھی جلد ہی جب شعری مجموعہ "اعراض" آنکھوں کے سامنے آیا اور اس بات کا پتہ چلا کہ یہ پہلے ایڈیشن کی آخری جلد ہے تو ذہن میں محفوظ شدہ ساری باتیں مخدوش نظر آنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات پر اطمینان بھی ہوا کہ بدصورتی کی تشکیل اور تسبیح خوانی کے اس دور میں بھی اُردو قارئین کا سلجھا ہوا مذاق سلامت ہے ۔

"اعراض" یہ بات اس کی خوبصورتی سے چلے گی اور جدید شاعری کے بدصورت حصّہ پر ختم ہو گی یہ کوئی طے شدہ بات نہیں ہے ۔ یہ تو مجموعے کے مطالعہ کے درمیان خود بخود نمو پذیر ہوئی ۔ دراصل جدید شاعری کا بدصورت حصّہ بہت کم نقّادوں کو نظر آ رہا ہے اور جن نقّادوں کو نظر آ رہا ہے وہ اتفاق سے بدصورتی کی حمایت میں ہیں ۔

تبصرہ نگار کو اس بات پر سخت اعتراض ہے کہ مجموعہ اتنا خوبصورت بھی نہیں چھپوانا چاہیئے کہ اُسے بیچنے کو دل نہ چاہے' یا اگر کوئی مانگ کر پڑھنے کے لیے لے جائے تو اس کا ایمان خطرے میں پڑ جائے ۔

ان تمہیدات کے بعد جب ہماری نظر اعراض کی شاعری میں اُترتی ہے اور جوں جوں آگے بڑھتی ہے ہمیں پتہ چلتا ہے یہ شاعری ترقی پسندی' جدیدیت اور کلاسیکیت کے امتزاج کے باعث ایک الگ ہی انداز اپنائے ہوئے ہے ؎

داد دے رنگِ زمانہ جس کی
مجھ کو اس رنگ کا بانی لکھو

اس چمن میں پھول تو ہر سمت بکھرے ہیں مگر
منفرد اپنی جگہ ہے میرا اپنا بانکپن

یہاں بے ساختہ جاں نثار اختر یاد آتے ہیں جنھوں نے نئی غزل کی توسیع کے لیے ترقی پسندی اور کلاسیکیت کو سمیٹ کر پورے توازن کے ساتھ جدیدیت کے دائرے سے ایک قدم آگے بڑھایا ۔ آج جو تازہ نسل اُبھر رہی ہے ، ایک نئی روایت کے ظہور کیلئے اُس کے ذہن میں ایک نیا باغیانہ تصور پرورش پا رہا ہے ۔ یہ وہ نسل ہے جس کے قدم "جدیدیت سے آگے" جانے کے لیے اُٹھ چکے ہیں ۔ یوں بھی جدید ادب پر اب تک کافی "خراجِ تحسین" اور قارئین کی ہمدردیاں حاصل ہو چکی ہیں ۔ اب ذرا ایک قدم اس دائرے سے آگے بڑھانا چاہیئے ؎ چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا ...... ورنہ یکسانیت کا سمندر گہری خاموشی کا بھنور بھی بن سکتا ہے اور دریائے شور بھی ۔ رئیس مالیگانوی کا اشارا غالباً اسی یکسانیت کی طرف ہے ۔ ؎

جانے کس درد کے صحرا میں بسے ہیں ہم لوگ
اب تو ہر سمت سے بس ایک صدا ہی آئے

اِعراض کے شاعر کا تعلق اسی بیدار نسل سے ہے جو فن کی حرمت اور تقدیس کے لیے تقلیدی جدیدیت کی بجائے نئی تخلیقی توانائی پر ایقان رکھتی ہے ۔ رئیس مالیگانوی نے کلاسیکی غزل سے نئی غزل تک آنے کے لیے تیس سال کا طویل ترین سفر صرف چند برسوں میں طے کیا ہے ۔ مطلب یہ کہ ان کی نئی غزل کی عمر زیادہ نہیں ہے لیکن گذشتہ سفر کا تیس ۳۰ سالہ تجربہ رکھتی ہے ۔ اس سے رئیس صاحب کے فنی خلوص اور ان کی ریاضت کا پتہ چلتا ہے ۔ انہوں نے راتوں رات نئی غزل پر چھاپہ مار کر اچانک خود کو نیا غزل گو شاعر نہیں کہلوایا ۔

ان کے یہاں تبدیلی تدریجی اور فطری طور پر رونما ہوتی ہے۔ اعراف کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ ان کا گذشتہ تیس سالہ ذہنی اور تخلیقی سفر اب مکمل طور پر پختگی بن کر اُبھرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل نئی حسیات کے ساتھ نئی محاسن سے بھی مسلح ہے۔

ایک طرف سدا بہار شاعر ادیب مالیگانوی کی اُستادانہ تربیت اور دوسری طرف تیس سالہ مشقِ سخن۔ ظاہر ہے "غالب مرے کلام میں کیونکر مزہ نہ ہو۔"

رئیس صاحب کے کلام میں رومانیت موجِ صبا کے مصداق ہے۔ ہلکی شیریں اور سبک خرام۔ یہ رومانیت ایک طرف تو غزل کے سراپے کو مصنوعی اور بے ڈھنگے کھردرے پن سے بچائے ہوئے اور دوسری طرف جمالیاتی احساس کو اپنی بہتوں میں جذب کئے ہوئے ہے ؎

آج وہ محوِ گفتگو ہے رئیس
کاش ہر لمحہ اک صدی ہو جائے

اس قسم کے بہت سارے اشعار "اعراف" کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔

جدید شاعری میں آزادی کے آس پاس کے افسانوں کی طرح مدقوق جنسیت اب نمایاں ہوتی ہے۔ انسانی جبلت، بربریت، خونخواری اور اذیت پسندی کا مریضانہ فنی اظہار فرائڈ وادی نظریے کی تشریح اور تشہیر کے طور پر "گرمی مضمون" بن چکا ہے۔ بڑے بڑے نام اس سمت لڑھک کر کیمرے کی بے حس آنکھ اور داخلی قلابازی یا خود سپردگی کا شکار ہو چکے ہیں (بعض خواتین زیادہ شکار ہوئی ہیں) جنسی نا آسودگی اور لذت پسندی کا بے باک اظہار اگر پرخلوص فنی رویہ ہے تو بلیو فلم؟ ——— اس رویہ پر اگر شاعر طنز کر بیٹھے (گہرا شگاف ڈال گئے اس کی ران میں نیزے گڑے ہوئے تھے ہوس کی چٹان میں) تو اس سے ایک وحشی گروہ کی مذمت ہوتی ہے۔

منٹو کے ان گنت افسانوں میں اسی گروہ کی جھلکیاں ہیں۔

اعراف کی شاعری زندگی کی مہربان یا نامہربان سانسوں کی طرح اُمید کی ڈور سے لپٹی ہوتی ہے۔ اُمید اور نا اُمیدی کے درمیان ہمیشہ ایک صحتمند کشمکش ہوتی ہے اور یہ کشمکش اسی وقت جاری رہتی ہے جب تک ہمت مردانہ ہو۔

؎ یہ جان کر بھی کہ بس تشنگی مقدر ہے
میں رشتہ پھر بھی سمندر سے جوڑتا ہی رہا

اس شعر سے تشنگی کے ذوق اور ظرف کا بھی پتہ چلتا ہے اور مسلسل جدوجہد کا بھی۔ اعراف کا یہ پہلا شعر مصنف کی پوری شاعری اور ان کے ذہنی سفر کا احاطہ کرتا ہے۔ ہمتِ مردانہ پوری شاعری پر محیط ہے۔ کہیں بھی شعر میں انسانی اور شاعرانہ وقار پسپا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ایک دلفریب جستجو اور شاہانہ انداز ہے جو اعراف کی غزلوں کو مریضانہ جدیدیت سے علاحدہ کر کے صحت مند قدروں سے ہمرشتہ کرتا ہے۔

ہر دور کی تقدیر کی تعمیر ہیں ہم لوگ
ہر سلسلۂ دار و رسن ہم سے چلا ہے

کتنی ہی یاروں سمت سے پتھراؤ کیجئے
آئینہ خلوص ہماری اساس ہے

انگڑائیاں لیتی ہیں جہاں زخم کی کلیاں
ہم تجھ کو بھی اے بادِ سحر لیکے چلیں گے

یہ اس کی ذات کی پہچان بن گئی ہے رئیس
بھرے دیار میں اُجڑا مکان رکھتا ہے

کسی کا کرب مدد کو پکارتا ہے رئیس
سکوں کا لیکے چلو ایک لشکرِ جرار

جدید شاعری کچھ مخصوص مضامین اور کچھ مخصوص لفظیات میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ تنہائی، بکھراؤ، ذات کا کرب، بے رنگی، بے چہرگی اور گھٹن وغیرہ جیسے جدید غزل کے اشعار میں ہمیشہ کے لیے بانٹ دیئے گئے ہوں۔ ظاہر ہے جب مخصوص موضوعات ذہن پر حاوی ہوں تو غیب سے مضامین خیال میں کس طرح آ سکتے ہیں۔ گذشتہ کچھ برسوں میں نام نہاد جدیدیت، انتہا پسند جدیدیت، صحت مند جدیدیت، فیشن ایبل جدیدیت، کچی جدیدیت، نقلی جدیدیت، اور تقلیدی جدیدیت جیسی نصف درجن سے زیادہ جدیدیات ظہور میں آگئی مگر موضوعات اور مضامین کی گونج تنوع سے خالی ہی رہی۔

انحراف اتنا کیا گیا کہ انحراف کی اہمیت ہی ختم ہوگئی۔ توڑ پھوڑ اتنی ہوئی کہ بہت سارے رسائل بند ہوگئے اور ان کی جگہ نثری شاعری وجود میں آگئی۔ جوڑ توڑ اتنی ہوئی کہ ؎ "بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آہی گیا"۔ یعنی نظمی نثری تحریک اُٹھنے لگی مگر اُٹھنے سے پہلے ہی "ادبی گر کے رہ گئی"۔ اب ظاہر ہے۔ "کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل"۔ انتشار پسندی بذاتِ خود ناپائیدار ہے ادب کو منفی کس طرح پہونچا سکتی ہے۔ ؎

اب تو ہر بات رواں ہے یارو
رنگ پیلا ہے تو دھانی لکھو

جدید ادب کی اس شعبدہ بازی پر "اعراض" کے نثر نگار عبدالمجید سرور صاحب نے اپنے مضمون میں کئی جگہ نہایت دیانتدارانہ رائے دی ہے۔ "رنگوں اور دشاؤں کا شاعر" کے عنوان کے تحت سرور صاحب نے مصنف اعراض کے تعارف کے ساتھ ساتھ پورے جدید ادب کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ان کی بھرپور محنت اور توجہ کا پتہ چلتا ہے۔ جدید ادب کے بدصورت حصے پر انہوں نے جس غیر جانبداری کے ساتھ قلم چلایا ہے اس کی دھار بہت سے انتہاپسندوں کو تلملا جانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ ممکن ہے سرور صاحب کی حق گوئی اور بے باکی دیکھ کر کچھ حضرات سوچنے لگ جائیں کہ یہ مضمون قلم سے لکھا ہوا ہے یا تلوار سے "تو اس" بارے میں عرض ہے کہ غلیل سے مضمون لکھنے کا رواج تو داغ کے دور میں ہی ختم ہو چکا ہے ......

مجموعہ کی ایک اہم خصوصیت بے انتہا خوبصورت کتابت اور طباعت ہے جس نے مجموعہ کو جلال و جمال کی سی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ شروع سے آخر تک کتابت و طباعت میں حد درجہ یکسانیت ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر خوش نویس اور پریس دونوں کی نفاست پسندی کا پتہ چلتا ہے۔ کاغذ نہایت سفید اور اعلیٰ ہے اور ان تمام خصوصیات کے پیشِ نظر کتاب کی قیمت دس روپے اتنی کم معلوم ہوتی ہے کہ ہر باذوق جیب حرکت میں آسکتی ہے۔

"اعراض" یقیناً ۱۹۷۵ء کی خوبصورت ترین اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ اس کی اشاعت پر ادارہ جمال ہر لحاظ سے تعریف اور مبارکباد کا مستحق ہے۔ تبصرہ نگار کو یقین ہے رئیس مالیگانوی کی شاعری اردو کے ہر حلقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور ان کی مناسب حوصلہ افزائی ہوگی۔

سلطان سبحانی

• حسن نعیم ــــــــــــــــــــ دہلی

"ہم زبان" کا پہلا شمارہ موصول ہوا ـــــ ظاہری شکل و صورت کے علاوہ اس کی کچھ اور صفات بھی دل نواز ہیں، اُمید کرتا ہوں کہ یہ رسالہ نئے ادب میں ایک اہم قابلِ ذکر رول انجام دے گا اور برسوں زندہ رہے گا۔

اختلاف کے عنوان سے آپ کا اداریہ ایک اہم موضوعِ ادب کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ غالباً اس موضوع پر کھل کر بحث کرنے کی ضرورت ہے، کیوں نہ آپ دو چار حضرات سے (جو مختلف مکاتبِ فکر کے ہوں تو بہتر ہے) درخواست کریں کہ وہ تفصیلی مضامین لکھیں۔

عتیق احمد عتیق کا خصوصی مطالعہ اگر ضروری تھا تو اس کے ساتھ ایک تجزیاتی مضمون بھی شاید ہونا چاہیے تھا۔ مجھے ان کی غزلیں پسند آئیں۔ اس شمارہ میں بھر تی کی تخلیقات کم ہیں۔ زیادہ تر چیزیں کسی نہ کسی زاویے سے آج کی نمائندہ تخلیقات ہیں۔ پھر بھی جی چاہتا ہے کہ "ہم زبان" اپنا ایک مخصوص کردار بنائے۔ سبھی رسالے ایک ڈھرے پر نکلتے ہیں وہی دو چار مضامین تین چار افسانے کچھ نظمیں کچھ غزلیں اور چند مختصر تبصرے اور پھر خطوط میں مدیر اور احباب کی ہمت افزائی۔

کیا یہ ممکن نہیں ہوگا کہ آپ تنقیدی مضامین کو خصوصی اہمیت دیں۔ گذشتہ دس پندرہ برسوں کے ادب کا سلسلہ وار جائزہ لیں، مثلاً کوئی شمارہ صرف نئے اور پرانے افسانوں کے لیے وقف ہو تو کوئی صرف انشائیوں کے لیے، اس طرح مختلف اصنافِ سخن پر ایک دو برسوں کے اندر سیر حاصل بحث ہو جائے اس کے بعد پھر جیسی صورتحال اُبھرے گی اس کے مطابق رویہ اختیار کیا جائے گا۔

اس طریقہ کار میں آپ کو محنت ضرور کرنی ہوگی لیکن آپ کو بھی احساس ہوگا کہ کچھ کام کیا ہے۔ ادب کی سمت متعین کرنے میں معاون ہوئے ہیں۔

جتنی محنت شمس الرحمٰن فاروقی نے "شب خون" کے اولین دور میں کی تھی اس کی آدھی محنت بھی آپ لوگ "ہم زبان" پر کر سکیں تو نئے ادب کی شناخت میں کچھ آسانیاں پیدا ہوں گی۔ اس وقت تو صورتحال خاصی Confused بلکہ بے سُری ہے۔ کئی طرح کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں لیکن کسی کا کسی کے ساتھ میل نہیں۔

● نظام صدیقی ــــــــــــــــــــ الہ آباد

مورلشش سے واپس آیا تو آپ کے خوبرو جریدہ کو اپنا منتظر پایا جو ہم زبانی کا خواستگار تھا۔ ــــ آپ کی ادبی صحافیانہ زندگی کا نقشِ اول ہی کیا کم ادبی اشرافیہ کے دل پر نشانات مرتسم کر گیا۔ نقشِ ثانی بھی پڑھنے لکھنے والوں کے دل پر لازوال اثرات ثبت کر جائے گا۔ آپ کے یہ دونوں خوش سلیقہ

طرحدار پرچے ادبی حلقوں میں داستانی کردار کے حامل بن گئے ہیں۔ خصوصاً ترقی پسند حلقہ میں اس کا انتہائی والہانہ طور پر تذکرہ ہوتا ہے۔ کل گھنٹوں اس کی کی بابت ڈاکٹر عقیل صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ ادھر آپ کی غزلیں بھی آہنگ میں دیکھیں۔ واقعتاً اعلیٰ کی تاثر انگیز ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ مشتملات میں ڈاکٹر قمر رئیس اور شہزاد منظر کے مضامین 'فیض' 'ندیم'، فہمیدہ ریاض اور عارف عبدالمتین کی منظومات، غلام ربانی تاباں، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر اجمل اجملی۔ صادق، منصور سبزواری، عبدالرحیم نشتر اور عتیق احمد عتیق کے اکثر اشعار پسند آئے۔ عشرت ظہیر اور عرفان عارف کے افسانے خوب ہیں۔ زاہدہ زیدی کی نظم اور شہزاد منظر کا انٹرویو پہلے کئی جگہ پڑھ چکا ہوں۔ زاہدہ کی نظم اتنی تاثر انگیز ہے کہ وہ کبھی حافظہ سے محو نہ ہوسکی۔ وہ شب خون، آہنگ اور کتاب میں پہلے بھی شائع ہو چکی ہے ——— آپ کے پرچے کے تبصرے متوازن اور سلامت رو ہیں ——— توقع ہے کہ آئندہ شمارہ مثالی کردار کا حامل ہوگا۔ اُردو میں کتنے ایسے جاذبِ نظر پرچے نکلتے ہیں جس سے احساس و جمال کو بھی آسودگی ملتی ہو۔ ٹائٹل مسرت اور بصیرت عطا کرتا ہے۔

● عشرت الاکرام ——————— مرزاپور

"ہمزباں" ملا، جی خوش ہوگیا۔ نئے نشانات کے مرتب سے جو توقعات تھیں ان سے بڑھ کر پایا۔ بلاشبہ آپ مشتملات سے صورت آرائی تک حد درجہ تندہی، جانفشانی اور خوش سلیقگی سے کام لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نثر و نظم کے انتخاب میں ذاتی احتساب کی قدرے مزید کارفرمائی ہو تو بہتر ہے۔ دُعا کرتا ہوں کہ "ہمزباں" ماہ و سال کی شاہراہ پر ثابت قدمی سے آگے بڑھتا رہے۔

● آزاد گلاٹی ——————— نابھہ (پنجاب)

پرچہ آپ نے پہلے ہی کی طرح خوبصورت نکالا ہے۔ آپ کے بنائے سرورق تو بس جان لیوا ہوتے ہیں۔

ظاہری خوبصورتی تو آپ کے ہر شمارہ کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ جہاں تک مضامین نظم نثر کا سوال ہے سبھی معیاری ہیں ——— عتیق صاحب کے تفصیلی مطالعہ میں تشنگی رہی۔ اگر ان کے کلام کے ساتھ ان کے فن اوران کی شخصیت پر ایک صفحہ کا مختصر سا مضمون شامل ہو سکتا تو مزہ آجاتا۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا مضمون جاندار ہے اور ان کے بیشتر مضامین کی طرح متاثر کرتا ہے۔ فہمیدہ ریاض صاحبہ کی نظم "بدن دریدہ" کی نظموں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ آپ نے ہندوستانی ادباء و شعراء کے پتے تو لکھ دیئے ہیں لیکن پاکستانی قلمکاروں میں سے چند کے پتے درج نہیں۔ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو سب کے پتے لکھ دیا کریں ———

● فاروق شفق ——————— کلکتہ

"بے باک" کے خصوصی شمارہ "نئے نشانات" کے بعد کسی نئے ماہنامے کے اعلان کا شدت سے انتظار تھا۔ بارے بہ تکلیف وہ انتظار ختم ہوا۔ "ہم زباں" اچھا اور خوبصورت نام ہے۔ خدا سے دُعاگو ہوں کہ اسے طویل زندگی نصیب ہو۔ "نشانات" کا آپ کو خاصا تجربہ ہے۔ اس لیے آپ سے بجا طور پر یہ اُمید باندھی جا سکتی ہے کہ "ہم زباں" بہت جلد رسائل کی دنیا میں اپنی الگ آواز اور منفرد جگہ بنالے گا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی اُمید ہے کہ "ہم زباں" کے ذریعہ "ہم عصر ادب" کی خاطر خواہ خدمت ہوگی اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے خوشگوار فضا تیار ہوگی۔

آپ سے ایک پُرخلوص اور دوستانہ اپیل یہ ہے کہ غزلوں اور نظموں کے نام پر آئی ہوئی ہر تخلیق کو قبول نہ کریں۔ تخلیق منظوم ہو یا نثری دیکھنا آپ کا کام ہے کہ تخلیق کو تخلیق کرنے کا کوئی جواز بھی ہے یا محض عادتاً ہی تخلیق وجود میں آگئی ہے۔ جو لوگ عادتاً لکھتے ہیں یا محض چھپنے کی حسرت میں لکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کا سختی سے احتساب کریں۔ اور ضرورت سمجھیں (خواہ وہ بہت معروف ادیب و شاعر کیوں نہ ہوں) تو ایسی تخلیقات یکسر اور بے تکلف رد کردیں۔ مجھے آپ کی ذات سے یہ بھی توقع ہے کہ آپ اس سلسلے میں کسی بھی مصلحت اندیشی اور شخصی تعلق کو اپنی راہ میں حائل نہ ہونے دیں گے۔ جدید شعر و ادب کے نام پر ہمارے یہاں آج کل جس نیشن زدگی اور دھاچوکڑی کا بول بالا ہے جس کے نتیجے میں جو زبردست یکسانیت پیدا ہوگئی ہے ہمیں اُمید ہے کہ آپ کا یہ پرچہ اس جمود کو توڑنے کی ہر ممکن

کوشش کرے گا۔ یقیناً یہ جدید شعروادب کی ایک اہم خدمت ہوگی۔

● عقیل شاداب ______ کوئٹہ

"ہم زباں" کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ آپ کی نفاست پسندی حرف حرف سے آشکارا ہے۔ نثر ہو نظم ہو یا کوئی بھی اصنافِ سخن ہو آپ کا لہجہ منفرد ہوتا ہے اس کے علاوہ مصوری میں بھی آپ کو جو دخل ہے اس سے رشک ہوتا ہے۔ آپ نے "ہم زباں" کی بابت رائے مانگی ہے، ظاہر ہے اتنے خوبصورت، متنوع اور پروقار جریدے کے لیے بجز تعریف کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ رہا ترقی پسند اور جدیدیت کا مسئلہ تو ان کے مابین کشمکش تعمیری و تخلیقی کشمکش ہے تخریبی نہیں۔ جو لوگ اسے تخریبی رُخ دیتے ہیں ان کی کند ذہنی پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ادب کے بہتے ہوئے دریا میں لہروں اور قطروں کا الگ الگ حساب رکھنا کورچشمی کی دلیل ہے۔ مختلف رجحانات اور تحریکات آپس میں وابستہ و پیوستہ ہوتی ہیں، ادب کے قاری کو ہر ایک کے مطالعہ کے لیے دوسرے سے بھی واقفیت رکھنا ضروری ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو کٹر ترقی پسند لکھا ہے کیا مضائقہ ہے۔ بھلا ترقی سے کس کافر کو انکار ہے مجھے خوشی ہے کہ آپ کو اپنی ترقی پسندی پر فخر ہے۔ ساتھ ہی آپ نے مجھے اپنا مخلص ترین اور بہترین دوست کہا ہے یہ جانتے ہوئے کہ میرا جھکاؤ جدیدیت کی طرف ہے مگر میں ترقی پسندی کا دشمن نہیں ہوں۔ جہاں بہترین صلاحیتیں صرف ہوں۔ اور اعلیٰ درجہ کا ادب تخلیق ہو وہاں روایتی ترقی پسند اور جدیدیت کی حدود ختم ہوجاتی ہیں۔ میرا معیار تو یہ ہے کہ زندگی اور ادب میں فرق نہ رہے گویا زندگی ادب بن جائے اور ادب زندگی بن جائے مسلک کچھ بھی ہو۔ ادب ہر حال میں اعلیٰ معیار کا ہوگا۔

● عتیق احمد عتیق ______ مالیگاؤں

آپ کی ذہانت وطباعی اور غیرمعمولی ادبی صلاحیتوں کا میں اس وقت سے معترف ہوں، جب آپ "انجمن نوجوان مصنفین" کی ادبی و تنقیدی نشستوں میں شریک رہ کر فنکاروں کی پیش کردہ تخلیقات پر نہایت بے باکی اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا کرتے تھے، اُس دور کی اکثر نشستوں میں جب کوئی فنکار آپ سے اُلجھتا تھا اور منصب نقد سے گرجاتا تھا تو آپ مسکرا کر اُسے بھی سنبھالتے تھے اور تخلیقات کے عیوب و محاسن پر غیر جانبدارانہ تبصرہ کرتے ہوئے محاسن کی تشریح پیش کرتے اور عیوب پر ہمدردانہ روشنی ڈال کر معترض کو صد فیصد مطمئن کردیتے تھے۔ اپنے اس ادارہ کو آپ لوگوں نے ملکر جب "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی شکل دیدی اور شعری و تنقیدی مجلسیں منعقد ہونے لگیں، اس زمانے میں تو آپ نے نام بدل بدلکر کچھ ایسے دھواں دھار مضامین لکھے تھے اور دھڑلے کے ساتھ انہیں پیش کیا تھا، سچ کہتا ہوں اور یہ منظر میں نے بھی دیکھا ہے کہ انجمن میں موجود لوگوں میں سے اچھے اچھوں کی پیشانیاں بھیگ کر رہ گئی تھیں۔

یہ تعریفی و توصیفی جملے آپ کو خوش کرنے یا غرورِ نفس میں مبتلا کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس حقیقت کا اظہار ہے جس پر کوئی خاک نہیں ڈال سکتا۔ سبھی جانتے ہیں کہ آپ بڑے کٹر قسم کے ترقی پسند ادیب و شاعر ہیں لیکن اس خصوصی نظریہ کے ہمیشہ سے قائل اور بڑی فراخدلی سے اس پر کاربند بھی رہے ہیں کہ "بنیادی لکیریں ہی پیٹتے رہنے سے نئی نئی راہیں نہیں نکلا کرتیں"۔ ساتھ ہی آپ ان خام تجرباتی کاوشوں کے بھی سخت مخالف رہے ہیں جن سے اچھا بھلا فن کار تجربے کی بھینٹ چڑھ کر رہ جاتا ہے۔ بہرکیف! میں مبارکباد پیش کرتا ہوں "ہم زباں" کے اجراء پر کہ اس کے پہلے ہی شمارہ میں آپ نے فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور غلام ربانی تاباں جیسے عظیم ادباء و شعراء کیساتھ ساتھ ڈاکٹر قمر رئیس (سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین ہند) ڈاکٹر اجمل اجملی — (جوائنٹ ایڈیٹر سوویت دیس) اور مختلف علوم وفنون پر خاصی دسترس رکھنے والا قلمکار اظہار اثر (جسے لوگ قانون والا کے نام سے بھی جانتے ہیں) نیز ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر عنوان چشتی، شاذ تمکنت، مصور سبزواری، وہاب دانش، مدحت الاختر، عبدالرحیم نشتر، رونق زیدی اور شہزاد منظر وغیرہ وغیرہ جیسے متوازن ذہن و فکر رکھنے والوں کی گرانمایہ تخلیقات شامل کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، کسی بھی ادبی مجلہ کے مدیر کو

اتنا فراخدل اور وسیع النظر تو ہونا ہی چاہیے کہ مختلف مکاتیب فکر کے لوگ اس کی ایک آواز پر اکٹھا ہو کر رہ جائیں ۔

مقامی فن کاروں میں لطیف جعفری، عرفان عارف، مجید کوثر، اظہار تسلیم، شہزادہ عثمان اور شبیر ہاشمی کا انتخاب بھی آپ کی ادبی بصیرت کی نشاندہی کیلئے کافی ہے ۔

خدا کرے ہم زبان ملک کے گوشے گوشے میں پہنچے اور اردو کا واحد نمائندہ رسالہ قرار پائے ۔

● رؤف خیر ____________ حیدرآباد

پرچہ ملا —— پرچہ نکالنا کوئی آپ سے سیکھے —— اتنے پیارے گیٹ اپ اور مواد کے ساتھ کہ جی خوش ہو جائے ۔ "اختلاف" کا جواب نہیں ۔ شہزاد منظر کی کہانی "یوٹوپیا" بہت خوب ہے ۔ راشد مفتی اور رزاق عادل کی غزلیں لطف دے گئیں ۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی نظم "بے نیاز" بہت پیاری نظم ہے ۔

● خالد علوی ____________ شاہجہانپور

"ہم زبان" کا پہلا شمارہ ملا ۔ اور ایک کرم نامہ بھی ۔ شکریہ —— آپ نے ہم زبان کے بارے میں میری رائے دریافت کی ہے —— تو مجھے اتنا عرض کرنے کی اجازت ضرور دیجئے کہ میں نے آپ کو ایک ذی ہوش اور باحوصلہ مدیر کی حیثیت سے اسی وقت تسلیم کر لیا تھا جب "نشانات" کے چند پرچوں کا مطالعہ کیا تھا ۔

"ہم زبان" بلاشبہ اس قدر حسین، جامع اور صاف ستھرا ہے کہ بے ساختہ آنکھوں سے لگا لینے کو جی چاہتا ہے ۔ تمام مندرجات قابل قدر ہیں اور پرچہ کے معیار و وقار کو متعین کرنے کے لیے ایک باشعور پیش رفت کہی جا سکتی ہیں ۔ نثر و نظم —— (دونوں حصے) اپنے جلو میں جدت فکر و جذبہ کی حیات افروز چنگاریاں لیے ہوئے ہیں ۔ لیکن افسانوی حصے کے لیے آپ نے بہت کم صفحات رکھے ہیں ۔ یہ بات بری طرح کھٹکتی ہے ۔ سرورق بہت ہی بامعنی اور رنگوں کے امتزاج کا ایک فکر انگیز نمونہ ہے ۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بے حد اچھا ہے ۔ ہاں کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی خامیاں ضرور نظر آئیں ۔ آئندہ شمارے میں انہیں بھی دور کرنے کی کوشش کیجئے ۔

● مشتاق احمد نوری ____________ پٹنہ

"نشانات" کی موت کے بعد آپ کی خاموشی یقیناً کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی ۔ اور یہ طوفان "ہم زبان" کی شکل میں نمودار ہوا ۔ یہ بلاشبہ صرف آپ کی سچی لگن اور کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ "ہم زبان" کا نقش اول اس منزل پر جلوہ افروز ہوا جہاں دیگر جریدے پہنچتے پہنچتے ہی دم توڑ جاتے ہیں ۔ اس شمارے میں بیشتر نام ایسے ہیں جو اس کی زندگی اور سلامتی کی ضمانت کے لیے کافی ہیں ۔ اردو کشی کے اس دور منحوس میں جبکہ اردو رسائل کا زندہ رہنا بذات خود ایک معجزہ ہے، کسی نئے ادبی رسالہ کا اجرا بلاشبہ جان جوکھم کا کام ہے ۔

منظوم حصہ کافی جاندار ہے ۔ منیفی کی غزل کے یہ دونوں اشعار بار بار پڑھتا ہوں اور ہر بار سر دھننے کو جی چاہتا ہے ۔

دیر سے آنکھ پر اترا نہیں اشکوں کا عذاب اپنے ذمہ ہے ترا قرض نہ جانے کب سے
کس طرح پاک ہو بے آرزو لمحوں کا حساب درد آیا نہیں دربار سجانے کب سے

شہزاد منظر کی کہانی "یوٹوپیا" کہانی نہیں بلکہ مکمل تاریخ ہے ۔ کہانی کی روانی طوالت کا احساس مٹا دیتی ہے ۔ کہانی پڑھنے کے بعد دیر تک ذہن پر سناٹا چھایا رہا ۔ اس احساس کو کونسا نام دوں ؟

سرورق کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی واقعی آپ نے مجروح کے شعر کو زندگی بخشی دی ہے ۔ میرے ترجمے "تدبیر" میں امریکی کے بجائے انگریزی کہانی شائع ہو گئی ہے ۔

● اظہار عابد ____________ کانپور

اس میں کوئی شک نہیں ماہنامہ "ہم زبان" آپ کی انتھک محنت و کاوش کا اچھوتا نمونہ ہے ۔ پہلا شمارہ ہونے کی وجہ سے شاید اب کے ادبی مضامین کا اجتماع نہ ہو سکا بس یہی قدرے کمی کا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن آئندہ کے لیے پر امید بھی ہوں ۔ غزلوں میں عتیق احمد عتیق کی پہلی غزل اچھی ہے ۔ منصور سبزواری ۔ راشد مفتی، اظہار اثر ۔ عبدالرحیم نشتر، اظہار تسلیم، رزاق عادل اور مجید کوثر کی غزلیں اپنا ایک مجموعی تاثر رکھتی ہیں ۔ نظموں میں احمد ندیم قاسمی کی نظم "میلاد" وحید اختر کی نظم "بے چہرہ آبادیاں" شاذ تمکنت کی برف باری ۔ فہمیدہ ریاض کی "برف باری کی رات" شاہین کی "بن باس" وہاب دانش اور رونق زیدی کی نظمیں

ایک تہہ دار Involvement کا مظہر ہیں۔ افسانے ابھی نہ پڑھ سکا تبصرہ کافی جامع اور پر مغز ہیں۔ آپ کا اداریہ "اختلاف" بہت پسند آیا۔ خاص طور سے یہ الفاظ کہ ــــ "وہ شئے ضرور زندہ رہتی ہے جس کا کوئی معرف ہو۔" تہہ دار معنی کے حامل ہیں۔

● اسلام پرویز ــــــــــــ سیتامڑھی

"ہم زبان" ہر لحاظ سے پسند آیا۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ خاص طور سے فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، وحید اخترؔ، شاذ تمکنتؔ، غلام ربانی تاباںؔ، عنوان چشتیؔ، مظفر سبزواریؔ، اظہار سلیم اور عتیق احمد عتیقؔ کی تخلیقات بہت ہی جاندار ہیں۔

● شوکت حیات ــــــــــــ پٹنہ

سلطان سبحانی سے مزید بہتر پرچے کی توقع تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے اسے عجلت میں ترتیب دیا ہے۔ بہرحال! اُمید ہے کہ آئندہ شمارہ اس سے بہتر ہوگا۔

قمر رئیس کا مضمون پسند آیا۔

● رانا سجاد ــــــــــــ سری نگر

آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ "ہم زبان" کے صفحہ ۶۱ پر کسی مسٹر مشتاق احمد نوری کا ترجمہ کیا ہوا افسانہ "تدبیر" پڑھا۔ آج سے کئی سال قبل یعنی ۱۹۷۵ء نومبر کے ہما ڈائجسٹ میں یہی کہانی "بعنوان تعاون" کے چھپی ہوئی ہے۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ دونوں ترجمے مسٹر مشتاق نے کئے ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہما میں چھپنے والی کہانی کا ترجمہ ادارے نے ہی کیا ہے۔ اور آپ کے رسالے میں چھپنے والے کا مسٹر مشتاق نے، لیکن کیا یہ صرف اتفاق ہے کہ دونوں ترجمے ہو بہو یکساں ہیں۔ صرف "تدبیر" میں الفاظ کو معمولی سا تبدیل کیا گیا ہے ــــ براہِ کرم میری یہ الجھن دور کریں۔ ہما ڈائجسٹ میں چھپی ہوئی کہانی بھی بھیج رہا ہوں ہما ڈائجسٹ کا خون کرنا پڑا ــــ

ترجمہ شدہ کہانی "تدبیر" سے متعلق بہت سارے خطوط میں یہی اعتراض کئے گئے ہیں۔ صفحات تنگ ہیں ورنہ "ہما" میں شائع شدہ کہانی بھی یہاں ضرور شائع کر دی جاتی ــــ ترجمہ "تدبیر" اور "تعاون" میں صرف چند لفظوں کی تبدیلی ہے۔

(ادارہ)

"کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور"

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

● سیٹھ ظ انصاری ــــــــــــ بمبئی

آپ کہیں گے "ہائیں" میں تو "ہمزبان" نکالنے کے لیے تعاون چاہتا تھا ــــ تو عرض ہے کہ ــــ سیٹھ سبحان کی "بیعت" میں جائیے، دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کیجیے کہ آپ ابھی تک ہمزبان نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئے، ورنہ وہ دن دور نہیں جب آپ ہمزبان نکالیں گے، مقروض ہوں گے، پھر آپ کے ہمزبان آپ کو نکالیں گے مالیگاؤں سے ــــ اور ہاں "کان میں سنیے"! ــــ سر پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا ــــ اس موضوع کا پٹارہ بند!

● ایک تجریدی خط ــــــــــــ علی امام پورنیہ

"کہانی رنگ بدلتی ہوائیں" واپس ملی ــــ شکریہ! ــــ آپ کی دسترس میں کائنات / میری دسترس میں اپنی ذات ــــ نئی زندگی اور نئے انسان کی تلاش آپ نے میری کہانی میں نہیں کی۔ یا پھر ہزاروں سال پرانا ٹوٹا پھوٹا انسانی ڈھانچہ برآمد ہوا۔

"غیر تجریدی اور غیر علامتی کہانی کی فرمائش نہ کرکے آپ مکمل تجریدی اور مکمل علامتی کہانی کی فرمائش کرتے تو صحت مندی ہوتی ــــ خیر اس کے باوجود بھی

بھی اگر "ہم زبان" زندہ رہا تو مجھے خوشی ہوگی۔ کیوں کہ آپ معتبر ہیں میرے لیے
Growth is panifal

اپنی آوازیں ہی جب بارِ سماعت ہیں ظہیر
چیختے گنبد میں بہتر ہے کہ میں گونگا رہوں

اُمید کہ آپ اچھے ہوں گے۔ متحرک جذبے کو میرا سلام۔ سیاسی شعور کی لہروں کے بہلے جانیے۔ کیجیے وہی جو آپ کے اندر کا آدمی چاہتا ہے۔

● انڈوں کا حساب ● عالی شان ذہنیت کا مظاہرہ ——
—— پرکاش فکری —— رانچی

رسالہ حسب توقع نہایت خوبصورت ہے۔ مگر آپ کے زاویہ نظر میں جو تبدیلی آئی ہے اس سے متفق ہونا میرے لیے دشوار ثابت ہو رہا ہے۔

قمر رئیس صاحب نے اپنے مضمون میں جیلانی بانو اور بلونت سنگھ کو بھی سکہ بند ترقی پسندوں میں شمار کر کے سارے انڈے اپنی ہی ٹوکری میں رکھ لئے ہیں انہوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ مضمون میں صرف ہندوستانی ناول نگاروں کا ذکر ہے۔ مگر ان ہندوستانیوں میں عزیز احمد اور شوکت صدیقی بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انہیں ہندوستانی شہریت ترک کیے ہوئے برسوں گذر گئے۔ دربھنگہ میں اُردو پر تبصرہ کرتے ہوئے آزادی نسواں کے سلسلے میں جس لکیر کے فقیر والی ذہنیت کا مظاہرہ ہوا ہے اس سے بھی اختلاف کیے بنا چارہ نہیں اور سوال اٹھتا ہے کہ ترقی پسندی اتنی غیر ترقی پسند کب سے ہوگئی۔۔۔

اداریہ

یہ وہ صفحہ ہے جسے لکھتے وقت مدیر تمام موضوعات
اور ہر طرح کے خسارے سے بالاتر ہوجاتا ہے

"ہم زبان" کا پہلا شمارہ اتنا پسند کیا گیا کہ آناً فاناً ساری کاپیاں کوچ کرگئیں اور بہت ساری پُرشوق آنکھیں دیدار سے محروم رہ گئیں ۔ ان کاپیوں کی اتنی مانگ دیکھ کر ہمیں حیرت ہونے لگی اور ہم سوچنے لگے ۔ کہیں کاپیوں کی بجائے ہم نے غلطی سے حوریں تو نہیں چھاپ دیں ؟

——— بہرحال اس خوشگوار تعلّی کے زیرِ اثر ہم ان تمام قارئین سے معذرت چاہتے ہوئے تازہ شمارے سے تعدادِ اشاعت میں زبردست اضافہ کر رہے ہیں ۔

اگرچہ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں ۔ مہرباں ہم پہ اگر یہ ہم زباں ہوجائے گا
"دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہوجائے گا"

مگر خیر کوئی بات نہیں ——— "جو بھی ہو گا عشق کا انجام دیکھا جائے گا"

ہم زبان کا دوسرا شمارہ پہلے ہی شمارے کی طرح انفرادیت لیے ہوئے ہے ۔ آئندہ شمارہ اور بھی منفرد رہے گا ۔ مگر یہ واضح رہے' ہم زبان کا سفر انفرادیت کی طرف ہرگز نہیں ہے ۔ جس طرح "اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل" اسی طرح ہم زبان بھی اپنی پہچان خود مقرر کر لے گا ۔ جب تک جیئے گا' مخصوص صحافتی روایت سے ہٹ کر جیئے گا اور ملک کے کسی بھی رسالہ کی تقلید کو اپنی موت سمجھے گا ۔ ظاہر ہے سفر بڑا آزمائش طلب رہے گا ۔ اب رہا اس کی زندگی کا سوال' تو زندگی کہاں کوئی سبا کی شہزادی ہے ۔ "ہر گھڑی درد کے پیوند لگے رہتے ہیں" اور ہم زبان پیوندکاری کے ہنر سے عاری ہے ۔ اسے اپنی زندگی کا لباس خود بُننا پڑے گا اور یہ ایسا کام ہے جس پر "بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا ہے میاں" (اشارہ مدیران کی طرف نہیں بلکہ میاں ہم زبان کی طرف ہے)

اب ایک اہم سوال' ہم زبان کے چلنے کا ہے ۔ یہ بات تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ گرماگرم ادبی بحثیں چلانے سے رسالے نہیں چلتے ۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے سائیکلیں چلائی جائیں کم از کم اس طرح پنکچر ہونے کا شرف تو حاصل ہو سکتا ہے ۔ بحثوں سے اگر مسائل حل ہوتے تو رسائل کیوں بند ہوتے ۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے بحثیں چلانے کی بجائے مضامین چلائے جائیں ۔ یہ ایک معقول اہم اور دیانتدارانہ ادبی سلسلہ ہے ۔ ہمیں امید ہے صفحہ ۶۵ کا اعلان ہر ادیب کو متوجہ کرے گا ۔ مضامین کی جسامت کے بارے میں عرض ہے ۔ اتنے طویل بھی نہ ہوں کہ مہابھارت اور داستانِ امیر حمزہ کے منہ میں پانی بھر آئے اور اتنے مختصر بھی نہ ہوں کہ خوش نویس خوش ہوجائے ۔

آخیر میں قارئین سے ایک درخواست ہے ۔ "ہم زبان" کو زیادہ نیا' زیادہ بہتر اور زیادہ برتر بنانے کیلئے مدیر کی تبدیلی کے علاوہ ہر قسم کی تبدیلیوں کے بارے میں ہمیں لکھیے ۔ آپ کے مشورے ہمیشہ زیرِ غور رہیں گے ۔
زیرِ نظر شمارے سے متعلق اپنی رائے سے نوازیے ۔ (مدیر)

HAMZUBAN Monthly

Regd. No. MH. Nsk -73

1
2

Nishat Book Centre,
Quidwai Road, Malegaon
(Nasik) M. S.

Price
Rs. 2. 50

Cover printed by : Lalit P. Press, 297, Maulana Azad Road, Bombay-400 004.